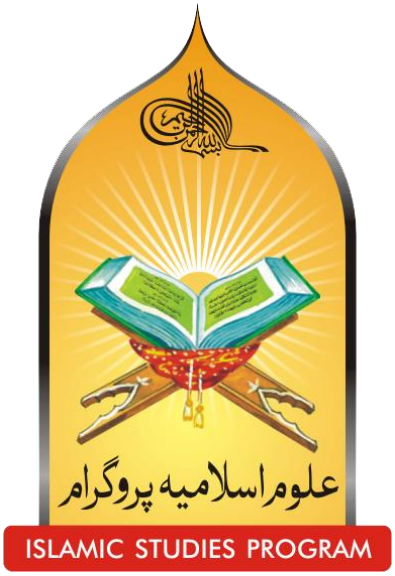
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت نبوی



ماڈیول IH02: عہد رسالت میں امت مسلمہ کی تعلیم، تربیت اور تعمیر شخصیت

محمد مبشر نذیر

www.mubashirnazir.org

فہرست

سیکشنA: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عمومی، سیاسی اور مذہبی صورتحال 8

باب1: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا تعارف۔۔۔بیک گراؤنڈ(571-609CE) 9

عہد رسالت(609-632/11H) 10

اعلان نبوت سے پہلے(571-609CE) 10

بچپن اور ابتدائی زندگی(571-585CE) 10

حرب فجار اور حلف الفضول(585-586CE) 13

عربوں کے معاشی حالات 14

نخلستان اور پانی 14

گلہ بانی اور شکار 15

جنگ اور غارت گری 15

گلوبل بزنس 16

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بزنس اور عائلی زندگی(583-609CE) 19

کعبہ کی تعمیر نو(605CE) 20

توحید اور شرک کی تاریخ(2000BC-605CE) 21

باب2: اعلان نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں دعوت دین(609-622CE) 25

پہلی وحی اور دعوت کا ابتدائی دور(609-612CE) 25

بڑے پیمانے پر دعوت دین کا دور(612CE کے بعد) 28

ہجرت حبشہ(614-616CE) 32

شدید مشکلات کا دور(615-619CE) 32

بائیکاٹ کا تشدد(616-619CE) 34

عام الحزن اور طائف کا سفر(619CE) 35

مکی زندگی کا آخری دور(619-622CE) 37

ہجرت نبوی(1H/622CE) 39

باب3: مدینہ منورہ میں سیرت نبوی(1-11H/622-632CE) 41

ابتدائی چیلنجز اور اقدامات 41

اہل مکہ سے اعلان جنگ(1H/622-623CE) 45

جنگ بدر اور اس کے بعد کا زمانہ(2-3/624-625) 46

جنگ بدر کے لیے تربیت کا طریقہ کار 47

جہاد کرتے ہوئے اخلاقیات کے احکامات 50

جنگ بدر کا نتیجہ (2-3H/624-625CE) 53

جنگ احد اور اس کے بعد کا زمانہ(3-5H/625-627CE) 56

جنگ احد کا پلان اور جنگ کی حکمت عملی(3H/625CE) 56

جنگ احد میں اہل ایمان کی شدید مشکلات اور اس کا حل 57

اہل ایمان کی شدید مشکلات کے باوجود منکرین کا فرار اور غزوۃ حمراء الاسد 58

جنگ احد کے بعد منافقین کا جعلی پراپیگنڈا(4-5/626-627) 60

جنگ خندق اور اس کے بعد کا زمانہ(5-6H/627-628CE) 62

عرب قبائل کے سب سے بڑے لشکر کا مدینہ منورہ پر حملہ(5H/627CE) 62

عربوں کے بڑے لشکر کیوں فرار ہوئے؟ 63

جنگ خندق کے بعد منافقین کا خواتین پر نفسیاتی حملہ(5-8H/627-630CE) 64

صلح حدیبیہ، جنگ خیبر اور اس کے بعد کا زمانہ(6-8H/628-630CE) 67

صلح حدیبیہ کا معاہدہ(6H/628CE) 67

جنگ خیبر(7H/628CE) 69

دنیا کے بادشاہوں کے نام خطوط 71

فتح مکہ، عام الوفود، غزوۃ تبوک اور حج الوداع(8-11/630-632) 75

فتح مکہ(8H/630CE) 75

جنگ حنین(8H/630CE) 79

غزوہ تبوک(9H/631CE) 79

عام الوفود اور طویل دعوت دین(9H/631CE) 79

سورۃ التوبہ۔۔۔ مشرکین کی فائنل سزا کا اعلان(9H/631CE) 80
حج الوداع(10H/632CE) 82
رخصتی(11H/632CE) 84

سیکشنB: علمی وفکری تاریخ 87

باب4: علم ودانش 88

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت 88
وحی کے تحمل کی تیاری 88
نفسیاتی تسکین 89
ایمانیات، اس کے دلائل اور دینی احکام کی تعلیم 91
بدلتے ہوئے حالات میں رہنمائی 91
تنبیہ وتادیب 91

صحابہ کرام کی تعلیم وتربیت 92
تعلیم وتربیت کا طریقہ کار 92
مکہ مکرمہ میں تعلیم وتربیت 94
مدینہ منورہ میں تعلیم وتربیت 95
علمی مجالس 96
عرب قبائل کی تعلیم وتربیت 96
تعلیم وتربیت کا نصاب 98
اگلی نسلوں کی تربیت 98
عربوں کے ذہن میں نفسیاتی تبدیلی 99

عہد نبوی میں علم ودانش 100
فن تحریر 100
قرآن مجید اور اس سے متعلق علوم 101
سنت نبوی اور اس سے متعلق علوم 101
علم الفقہ 102
تاریخ 103
فلسفہ 103
سائنس اور ٹیکنالوجی 105
انسانی اور سماجی علوم(Humanities and Social Sciences) 105
دوسری زبانوں کا علم 106

سیکشنc: دعوتی تاریخ 109

باب5: دعوت اسلام کی نوعیت 110

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کیا تھی؟ 110

قانون دینونت(Law of Divine Reward and Punishment) کیا ہے؟ 110

رسول اللہ کی دعوت میں کیا امور شامل تھے؟ 114

رسول اللہ کی دعوت کی مقبولیت کے اسباب 118

دعوت اسلام کی مقبولیت میں قرآن مجید کا کردار 124

فصاحت وبلاغت کی وضاحت 124

اسلوب بیان 126

فصاحت وبلاغت کا معجزہ 127

قرآن اور جذبات 129

قرآن اور عقل 130

دعوت اسلام کی مخالفت 131

مخالفت کے اسباب 131

دعوت اسلام کی مخالفت اور اس پر مسلمانوں کا ردعمل 133

دعوتی میدان میں صحابہ کرام کا کردار 135

باب6: دعوتی اسٹریٹیجی 139

مختلف گروہوں کے معاملے میں دعوتی اسٹریٹیجی 139

مشرکین بنی اسماعیل کو دعوت 139

یہود کو دعوت 141

عیسائیوں کو دعوت 144

حنفا کو دعوت 145

منافقین کو دعوت 146

مکہ میں دعوتی حکمت عملی(Strategy) 146

ذرائع ووسائل کا استعمال 146

معجزات نبوی کا دعوت کی مقبولیت میں کردار 148

مکی زندگی کے مختلف ادوار میں دعوتی اسٹریٹیجی 149

مکی زندگی کے اختتام پر دعوت اسلام کے نتائج 150

مدینہ میں دعوتی حکمت عملی 150

مدینہ منورہ میں دعوت کی قبولیت کے اسباب 151
مدنی زندگی کے مختلف ادوار میں دعوتی اسٹریٹیجی 152
عرب قبائل میں اسلام کی دعوت کے فروغ کے اسباب 153
مدنی زندگی میں مکہ میں فروغ دعوت 154
دعوتی حکمت عملی میں شادیوں کا کردار 156

انٹرنیشنل سطح پر دعوت 156

دعوتی نقطہ نظر سے مکاتیب نبوی کا تجزیہ 157
بادشاہوں کا ردعمل 160
نجاشی شاہ حبشہ 161
قیصر روم 162
مقوقس شاہ مصر 164
شاہان غسان 164
کسری شاہ ایران 165
جزیرہ نما عرب کے بادشاہ 165
کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟ 165

سیکشنD: تہذیب وتمدن کی تاریخ 168

باب7: تہذیب وتمدن 169

سیاسی نظام 169

مستحکم سیاسی نظام کا قیام 169
حکومتی شعبہ جات 170

معیشت 171

مہاجرین کی آبادکاری اور مؤاخات 172
نظام زکوۃ 172
دولت کے ارتکاز میں کمی 173
زراعت اور گلہ بانی کا فروغ 174
صنعت اور تجارت کی ترقی 175
اخراجات میں اعتدال اور توازن 176

معاشرت 176
معاشرتی اقدار (Values) 176
قبائلی دشمنیوں کا خاتمہ اور ان میں قربت (Integration) 179
مرد اور خواتین کے حقوق میں توازن 180
غلامی کا خاتمہ 181
معاشرتی طبقات 182
شہری امور اور ٹاؤن پلاننگ 183
ثقافت (Culture) 184
تہوار 185
تجارتی اور ثقافتی میلے 185
کھیل اور تفریح 185
فنون لطیفہ (Fine Arts) 186
روحانی زندگی 187
عہد نبوی کی تہذیبی تاریخ کا خلاصہ 189

سیکشن A: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عمومی، سیاسی اور مذہبی صورتحال

باب 1: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا تعارف۔۔۔بیک گراؤنڈ (571-609CE)

عہد نبوی (609-632/11H) سے مراد وہ دور ہے جس کا آغاز 609CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام 11H/632CE میں آپ کی وفات پر ہوتا ہے۔ یہ دور کم و بیش 23 برس پر محیط ہے۔ اس کا مطالعہ اس وجہ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ اسی میں مسلم تہذیب کی بنیادیں رکھی گئیں۔ اس دور کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "خیر القرون (عمدہ دور)" سے تعبیر کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے یہی دور، پوری مسلم تاریخ میں سب سے اعلی و ارفع دور ہے۔

امید ہے کہ ویسے تو اس کتاب کے قارئین سیرت نبوی کا مطالعہ کر چکے ہوں گے لیکن اس باب میں ہم اس دور کا عمومی مطالعہ کریں گے تاکہ سیرت طیبہ کے اہم واقعات ہمارے ذہنوں میں تازہ ہو جائیں۔ اگر آپ نے سیرت نبوی کا اب تک مطالعہ نہیں کیا تو بہتر ہے کہ اس موضوع پر کم از کم ایک مفصل کتاب کا مطالعہ کر لیجیے۔ یہاں ہم سیرت طیبہ کا محض ایک خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ اس کی مدد سے اس دور کے علمی، فکری، دعوتی اور تہذیبی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملے گی جس کا مطالعہ ہم اگلے ابواب میں کریں گے۔

آخری سیکشن میں یہ مطالعہ کریں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کی تعلیم و تربیت کی تھی تو کس طرح کی شخصیتیں سامنے آئیں کہ جنہیں تاریخ میں عمدہ ترین انسان سمجھا جاتا ہے۔ یہ خیال صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ غیر مسلم اسکالرز نے بھی یہی بتایا کہ یہ خوبصورت شخصیت والے انسان گزرے تھے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ ہم بھی اپنی اور اگلی نسل کی تعمیر شخصیت کر سکیں اور ایسے اعلی انسان بننے کی کوشش کر سکیں۔

اس پورے دور کو ہم ان ذیلی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- اعلان نبوت سے پہلے کا دور (571-609CE)
- مکی دور (609-622CE)
- مدنی دور (1-11H/622-632CE)

آپ اس کیلنڈر میں دیکھ لیجیے گا کہ CE سے مراد Current Era کہا جاتا ہے۔ یہ کیلنڈر حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام سے شروع ہوتا ہے اور اس تحریر کے وقت 2026CE کا سال جاری ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش

571CE سے شروع ہوئی اور 632CE میں آپ کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے ساتھ جس سال میں H لکھا ہوا ہو تو اس سے مراد ہجری کیلنڈر ہے۔ یہ کیلنڈر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے سال (622CE) میں شروع ہوا اور آپ کا انتقال 11H میں ہوا ہے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ ہجری سال اور شمسی سال میں 10, 11 دن کا فرق ہوتا ہے۔

عہد رسالت (609-632/11H)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- اعلان نبوت سے پہلے کا دور
- اعلان نبوت کے بعد مکی دور
- مدنی دور

اعلان نبوت سے پہلے (571-609CE)

محمد بن عبد اللہ (571-632CE) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش مکہ مکرمہ میں قبیلہ قریش کے ایک خاندان بنو ہاشم میں ہوئی جو کہ مکہ کے مشہور بادشاہ قصی بن کلاب کی نسل میں ایک اہم خاندان تھا۔ آپ کے والد ماجد کا نام عبد اللہ (d. 570) اور والدہ ماجدہ کا نام آمنہ (d. 577) تھا۔ والدہ کا تعلق یثرب (مدینہ منورہ) سے تھا اور وہ شادی کر کے مکہ مکرمہ آئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے چند ماہ قبل ہی آپ کے والد عبد اللہ صاحب وفات پا گئے تھے چنانچہ آپ کی پرورش والدہ نے کی۔

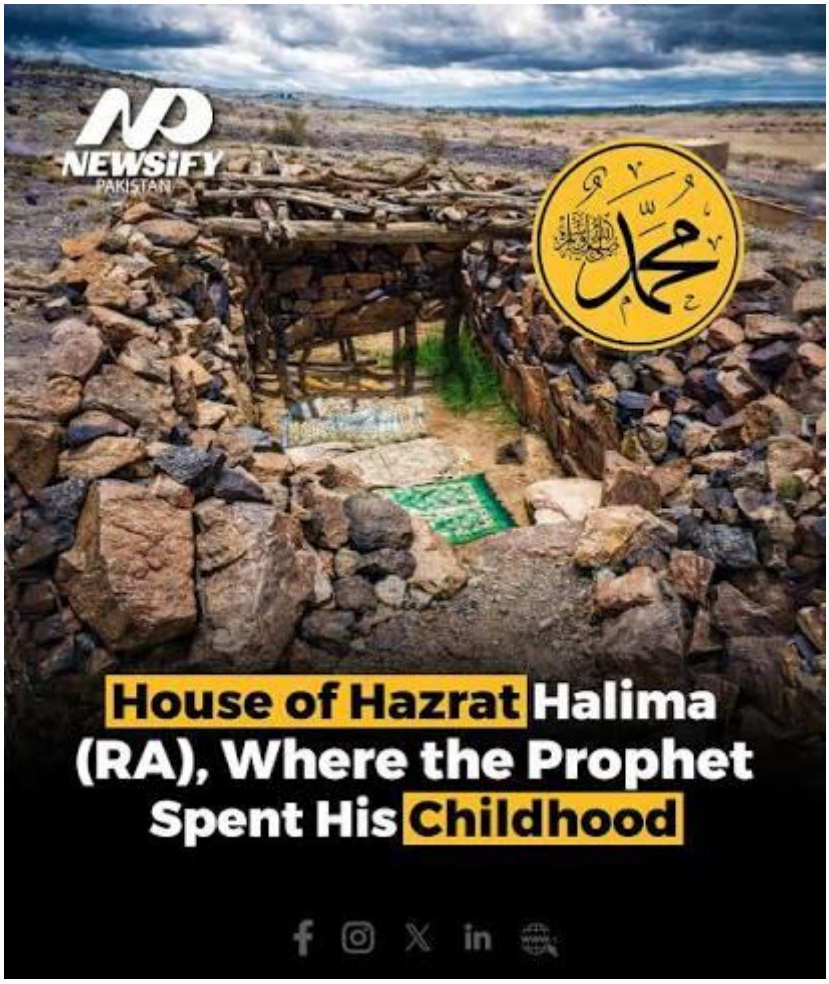
بچپن اور ابتدائی زندگی (571-585CE)

عربوں کے عام رواج کے مطابق آپ کی ابتدائی پرورش طائف کے قریب قبیلہ بنو سعد کی ایک خاتون حلیمہ سعدیہ (d. c. 8/629) رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں ہوئی۔ اس رواج کا مقصد یہ تھا کہ بچہ گاؤں کی کھلی فضا میں پرورش پائے اور بہترین درجے کی فصیح و بلیغ زبان سیکھے جو شہری اثرات سے پاک ہو۔ عرب کلچر یہ تھا کہ دیہاتی خواتین شہر میں آتیں تاکہ وہ چھوٹے بچے کو گاؤں میں لے جائیں۔ اب چند دن یا ایک ماہ کا بچہ جب گاؤں میں آتا تو دیہاتی خاتون انہیں دودھ پلاتیں اور کھلے ماحول میں پرورش کرتیں۔ اس طرح بچے کی صحت اچھی ہوتی جبکہ اس کے ساتھ ہی عمدہ زبان بچے کو آجاتی۔

عربوں کے ہاں زبان و بیان کی بہت اہمیت تھی۔ مکہ مکرمہ جیسے شہر میں بہت سے علاقے کے لوگ حج و عمرہ کے لیے آتے تھے، اس لیے بچے کی زبان خراب ہو سکتی تھی کیونکہ ہر 500 کلو میٹر بعد کے علاقے میں زبان میں فرق آتا تھا تو چھوٹے بچے کنفیوژن میں آسکتے تھے۔

اس لیے دیہات میں صاف اور واضح زبان ہی بچے سیکھ لیتے تھے اور پھر ساری زندگی تک عمدہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ گفتگو جاری رہتی تھی۔

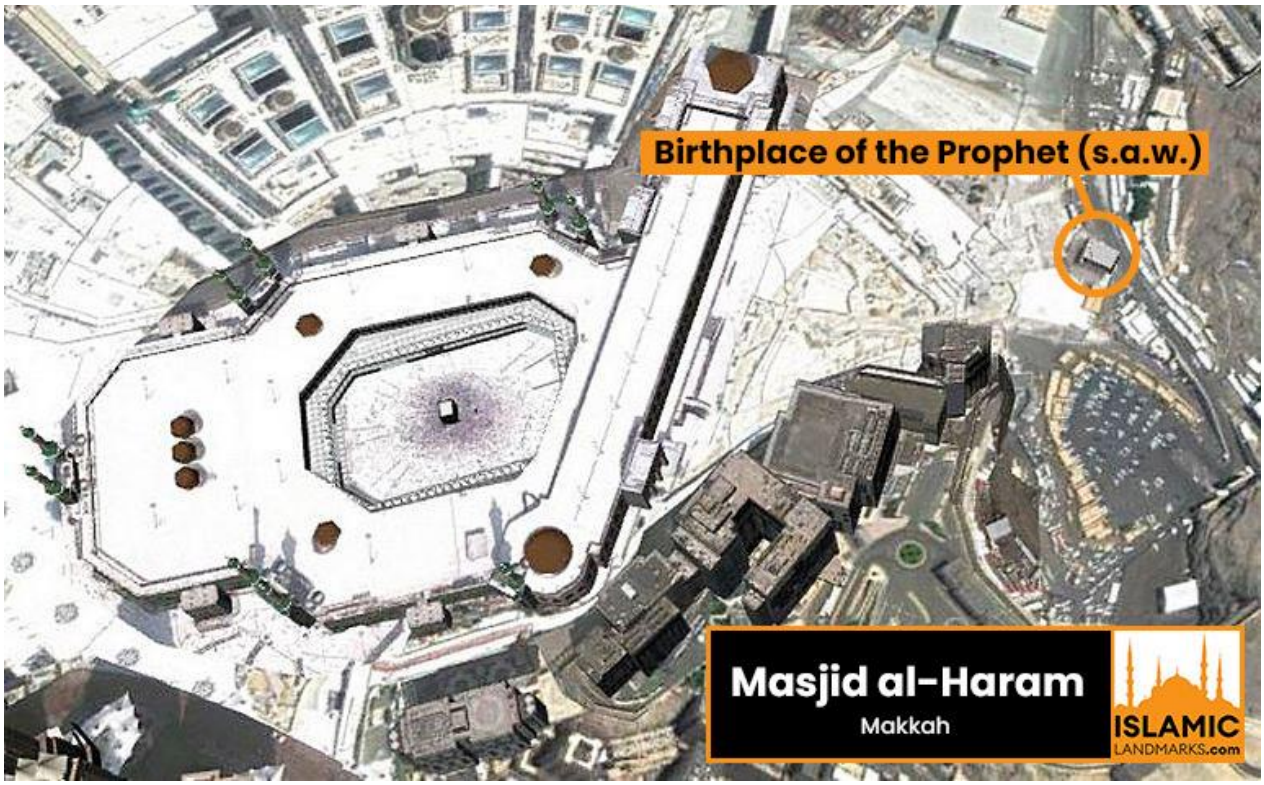
حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا قبیلہ بنو سعد ابھی بھی بہت سے دیہات میں موجود ہے اور اس میں حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے کھنڈرات موجود ہیں۔ اس میں آپ گلوبل میپ کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں کہ یہ گاؤں مکہ مکرمہ سے تقریباً 160 کلومیٹر دور ہے۔ دو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس گاؤں میں دودھ پیتے رہے، دیہاتی بچوں سے کھیلتے رہے اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ عمدہ ترین عربی زبان سیکھی۔ کچھ مہینوں میں حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا آپ کو مکہ مکرمہ میں لے جاتیں اور والدہ آمنہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کروالیتیں۔ جب دودھ پلانے کے بعد والدہ کے حوالے کر دیا۔



https://www.google.com/maps/dir/Makkah+Saudi+Arabia/Haleema+Sadia+House%D8%8C+Al+Taif+26963,+Saudi+Arabia%E2%80%AD/@21.3195138,39.6771173,157048m/data=!3m2!1e3!4b1!4m13!4m12!1m5!1m1!1s0x15c21b4ced818775:0x98ab2469cf70c9ce!2m2!1d39.8173364!2d21.4240968!1m5!1m1!1s0x15e96e95f26e8b6d:0xb2c8f6ba66a3578d!2m2!1d40.8569222!2d21.0008112?entry=ttu&g_ep=EgoyMDI2MTAxNC4wIKXMDSoASAFQAw%3D%3D

اگلے چار سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت آپ کی والدہ سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کرتی رہیں لیکن جب آپ کی عمر چھ سال ہوئی تو اس وقت آپ میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا جناب عبد المطلب (d. 579) نے آپ کو

اپنی کفالت میں لے لیا۔ اس وقت لائف اسٹائل یہ تھا کہ جوائنٹ فیملی کی طرح پوری فیملی کے گھر ساتھ ساتھ ہی ہوتے تھے کیونکہ سکیورٹی اسی طرح ممکن تھی۔ اس فیملی بنو ہاشم کا محلہ صفاء پہاڑی کے بالکل قریب ہی تھا اور سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کے گھر کو موجودہ زمانے میں لائبریری کی شکل میں موجود ہے۔





عبد المطلب بنو ہاشم کے سردار تھے اور مکہ کی شہری ریاست کو چلانے والی کونسل کے رکن تھے۔ ان کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی پرورش آپ کے چچا ابو طالب (d. 619) نے کی۔ بعض روایات میں آپ کے بڑے تایا زبیر بن عبد المطلب کا ذکر بھی آتا ہے جو کہ ابو طالب سے پہلے اور عبد المطلب کے بعد بنو ہاشم کے سربراہ تھے۔ ممکن ہے کہ دونوں چچاؤں نے یکے بعد دیگرے آپ کی پرورش میں حصہ لیا ہو کیونکہ اس بنو ہاشم فیملی کے سربراہ کی ذمہ داری تھی۔

حرب فجار اور حلف الفضول (585-586CE)

585-586CE میں قبیلہ قریش اور قیس کے درمیان جنگ چھڑ گئی جسے "حرب فجار" کہا جاتا ہے۔ قبائلی علاقوں میں کسی بھی اختلاف کی وجہ سے قبیلے آپس میں جنگ کر دیتے تھے۔ اس جنگ میں قریش کے سپہ سالار حرب بن امیہ تھے اور زبیر بن عبد المطلب بنو ہاشم کے علم بردار تھے۔ علم بردار اس شخص کو کہتے تھے جو جنگ کے دوران اپنی فوج کا جھنڈا پکڑ لیتا تھا اور وہ اس فوج کے اہم ترین کمانڈر ہوتے تھے۔ اگر جھنڈا گر جاتا تو اسے سمجھا جاتا کہ اس فوج کو شکست مل گئی ہے۔

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر 15 برس تھی اور آپ نے اس جنگ میں عملاً حصہ نہیں لیا مگر اپنے چچاؤں کی مدد کی جیسے تیر یا تلوار پکڑا دی۔ جنگ کے خاتمے پر جناب زبیر نے قریش کے خاندانوں کو اکٹھا کر کے ایک معاہدہ کیا جو "حلف الفضول" کہلاتا ہے۔ اردو میں لفظ فضول تو منفی معنی میں سمجھا جاتا ہے لیکن عربی میں الفضول کا معنی ہے کہ فضل نام کے لوگوں نے سائن کر دیا تھا۔ اس نام کی وجہ یہ تھی کہ اس میں شریک کئی لوگوں کا نام "فضل" یا "فضیل" تھا۔ معاہدے میں یہ بات طے پائی کہ ہر شخص مظلوم کی مدد کرے گا اور کسی ظالم کو مکہ مکرمہ میں نکال کر کبھی رہنے کی اجازت نہ ہو گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبائلی جنگوں کو بچپن ہی میں پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ اس عمدہ معاہدے کو اتنا پسند فرمایا کہ آپ اعلان نبوت کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ یہ معاہدہ مجھے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ پسند ہے اور اگر مجھے اس معاہدے میں شرکت کے لیے دعوت دی جائے تو ضرور میں شریک ہوں گا۔[1] حلف الفضول کے تحت قریش کے صالح نوجوانوں نے ایک تنظیم بھی بنا رکھی تھی جو ہر مظلوم کی دادرسی کیا کرتی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس تنظیم کے رکن تھے تاکہ مظلوم کی مدد کریں۔

ایک موقع پر مکہ مکرمہ کے ایک بااثر تاجر نے ایک غریب کی بیٹی کو اغوا کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے اس تاجر سے اس بچی کو بازیاب کروایا۔ ابو جہل نے ایک کمزور تاجر سے مال لے لیا مگر اس کی قیمت ادا نہیں کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنا مجبور کر دیا کہ اسے قیمت ادا کرنی ہی پڑی۔[2] اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ نبوت سے پہلے نوجوان لڑکے کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ کیسا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ اور دیگر عرب قبائل کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتے تھے حالانکہ ابھی نبوت کا کوئی سلسلہ نہیں ہوا تھا۔

---

[1] شبلی نعمانی۔ سیرت النبی۔ 1/115-116۔ www.attablig.com (3 Dec 2010)

[2] محمد کرم شاہ الازہری۔ ضیاء النبی۔ 2/124-125

عربوں کے معاشی حالات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش جب ہوئی تو اس وقت انڈسٹری نہیں تھی بلکہ معاشی طور پر اگریکلچر ایج کا زمانہ تھا۔ تمام زرخیز علاقوں میں کھیتوں پر کام ہوتا تھا تو یہی امیر ترین لوگ تھے۔ جزیرہ نما عرب کے معاشی حالات، زرعی علاقوں جیسے عراق، شام اور مصر کی نسبت نہایت ہی خراب تھے کیونکہ اس کا تقریباً 95% حصہ صحرا پر مشتمل تھا جہاں پانی بہت کم تھا جبکہ تیل کی دولت اس وقت دریافت نہ ہوئی تھی۔ صحرائی زندگی میں چند ایسی چیزیں تھیں، جو دنیا کے دیگر خطوں کی نسبت بہت زیادہ قیمتی تھیں اور یہی وجہ نزاع بنتی تھیں۔ ان میں پانی، اونٹ، بکریاں اور نخلستان نمایاں تھے جس کی وجہ سے قبائل آپس میں لڑتے رہتے تھے۔

نخلستان اور پانی

ان میں سب سے نمایاں چیز پانی تھا جو کہ انسان اور حیوان دونوں کی زندگی میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اللہ تعالی نے صحراؤں کے اندر بعض ایسے مقامات رکھے ہیں جہاں پانی نسبتاً کم گہرائی پر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہاں کچھ سبزہ اور پودے بھی اگ آتے ہیں۔ انہیں نخلستان (Oasis) کہا جاتا ہے۔ صحرائے عرب میں جہاں جہاں نخلستان پائے جاتے تھے، وہاں انسانی آبادیاں موجود تھیں۔

بڑے نخلستانوں میں یثرب (یعنی مدینہ منورہ)، خیبر اور یمامہ کے علاقے تھے۔ صحرا میں بارش بہت کم ہوتی ہے لیکن جب ہوتی ہے تو پھر سیلاب آجاتا ہے اور اس کے نتیجے میں پانی کے کئی ذخائر اور تالاب وجود میں آتے ہیں اور زمین پر بھی بہت سے پودے اگ آتے ہیں جو کہ کافی عرصے تک جانوروں کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ ان نخلستانوں، پانی کے تالابوں اور چراگاہوں پر قبضے کے لیے عرب قبائل میں جنگ رہا کرتی تھی۔

جنوبی عرب کے علاقے میں بارشیں زیادہ ہوتی ہیں، اس وجہ سے وہاں حالات بہتر تھے۔ آپ تاریخ میں پڑھ چکے ہوں گے کہ اہل یمن نے چھوٹے بڑے ڈیم تعمیر کر کے اپنے پورے علاقے میں زراعت کو غیر معمولی فروغ دیا اور اس کے نتیجے میں قوم سبا دنیا کی امیر ترین قوموں میں شمار ہونے لگی۔ بائبل میں بھی سب سے زیادہ زرخیز اور امیر ملک یمن سمجھا جاتا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت عصیر ریجن کی تھی جس میں ابہا اور الباحہ کے علاقے شامل ہیں۔ یہ علاقہ اب سعودی عرب کا حصہ ہے۔

شمال میں یثرب اور خیبر کے علاقے زرخیز تھے اور یہاں کاشت کاری ہوا کرتی تھی اور اس علاقے کی سب سے اہم پراڈکٹ کھجور تھی اور آج بھی ہے۔ مزید شمال کے علاقے تیما، دومۃ الجندل اور تبوک میں زراعت زیادہ منظم تھی۔ اس سے مزید شمال میں اردن، فلسطین، سیریا اور لبنان کے علاقے انتہائی زرخیز تھے لیکن وہاں رومن ایمپائر نے قبضہ کیا ہوا تھا۔ اسی طرح عراق میں دو دریا فرات اور دجلہ بہت زرخیز رہا تھا تو ایرانی سلطنت سے قبضہ کیا ہوا تھا۔ سب سے عمدہ علاقوں کو رومن اور ایرانی بادشاہوں نے قبضہ کر کے خزانے بنا لیے تھے جبکہ عوام کو بہت کم آمدنی ہی ملتی تھی۔

گلہ بانی اور شکار

قدیم عربوں کی معیشت میں مویشی انتہائی اہمیت کے حامل تھے جن میں سب سے اہم جانور اونٹ تھا۔ عرب بڑے شوق سے اونٹ پالتے، اسے طویل فاصلوں کی سواری کے لیے استعمال کرتے، اونٹنی کا دودھ پیتے اور حسب ضرورت انہیں ذبح کر کے گوشت بھی حاصل کر لیتے۔ گھوڑے بھی بطور سواری کے لیے استعمال ہوتے تھے مگر ان کا استعمال اونٹوں کی نسبت کم تھا کیونکہ صحرا کی مشکل زندگی میں اونٹ بہتر سواری تھی۔ گدھے بھی کم فاصلے کی سواری کے لیے استعمال ہوتے تھے مگر ان کا استعمال زیادہ تر غریب لوگ کیا کرتے تھے۔ بھیڑ بکریاں بھی پالی جاتی تھیں اور ان سے اون، دودھ اور گوشت حاصل کیا جاتا تھا۔

مویشیوں کے لیے عربی میں "مال" کا لفظ استعمال ہوتا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اصل مال و دولت یہی تھی۔ لونڈیاں اور غلام بھی مال و دولت میں شمار ہوتے تھے اور ان کی خرید و فروخت کی باقاعدہ منڈیاں موجود تھیں کہ جس میں مردوں، لڑکیوں اور بچوں کو بھی بیچ کر رقم حاصل کی جاتی تھی۔ اسی کو "جاہلیت" کہا جاتا تھا۔ عرب معیشت میں شکار بھی ایک اہم پیشہ تھا تاہم اس کی اہمیت قدیم دور کے مقابلے میں زیادہ نہ رہی تھی۔ صحرا میں جو جانور دستیاب تھے، ان کا شکار کر کے گوشت حاصل کیا جاتا تھا۔ یہ شکار، آج کل کی طرح محض تفریحی شکار نہ تھا بلکہ اس کا مقصد خوراک کا حصول ہوتا تھا۔ ساحلی علاقوں پر آباد لوگ مچھلی کا شکار کرتے تھے۔

جنگ اور غارت گری

عربوں کی معیشت میں جنگ کی بھی بہت اہمیت تھی۔ جو قبیلہ طاقت ور ہوتا، وہ کمزور قبیلے پر حملہ کر کے اس کا جمع کردہ مال و اسباب لوٹ لیتا۔ تجارتی قافلوں کو لوٹ لینا ایک معمول کی بات تھی۔ مال غنیمت کی جستجو انہیں جنگوں پر آمادہ کرتی تھی۔ جنگ میں فاتح کو مویشی، صنعتی اشیا، غلہ اور دیگر اشیا کے علاوہ غلام اور لونڈیاں بھی ہاتھ آتے۔ مفتوحین کے جنگجو مردوں کو قتل کر دیا جاتا اور جنگ نہ کرنے والے مردوں، خواتین اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا۔ ان غلاموں سے محنت و مشقت والے کام کروائے جاتے تھے اور مالک کو اپنے غلام کی زندگی اور موت کا مکمل اختیار ہوا کرتا تھا۔

اس کی تفصیل آپ میری کتاب **"اسلام میں ذہنی و جسمانی غلامی کے انسداد کی تاریخ"** میں دیکھ سکتے ہیں کہ جنگ جیتنے پر قبیلے کے مردوں اور خواتین کو غلام بنا دیا جاتا تھا اور پھر جبر کے ذریعے ان سے محنت کی جاتی تھی۔ عورت کو لونڈی بنا کر اس کا مالک ازدواجی تعلق کر لیتا اور جب چاہتا تو اس لڑکی کو بیچ کر رقم لے لیتا تھا۔ انسان کی اخلاقی حیثیت ایسی خراب ہو چکی تھی کہ اسے عرب ہی "جاہلیت" کہتے تھے اور اس میں فخر کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے سب سے مشہور شاعر عمرو بن کلثوم (d. 600CE) کے اس سپر ہٹ شعر کو دیکھیے کہ اس میں کتنا تکبر ہے اور اس میں عرب لوگ فخر کیا کرتے تھے۔

أَلَا لَا يَجْهَلَنْ أَحَدٌ عَلَيْنَا ** فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الجَاهِلِينَ

ترجمہ: "خبردار! ہمارے خلاف جہالت نہ کرنا ورنہ یاد رکھنا کہ ہم تم سے زیادہ بڑے جاہل ہیں۔"

گلوبل بزنس

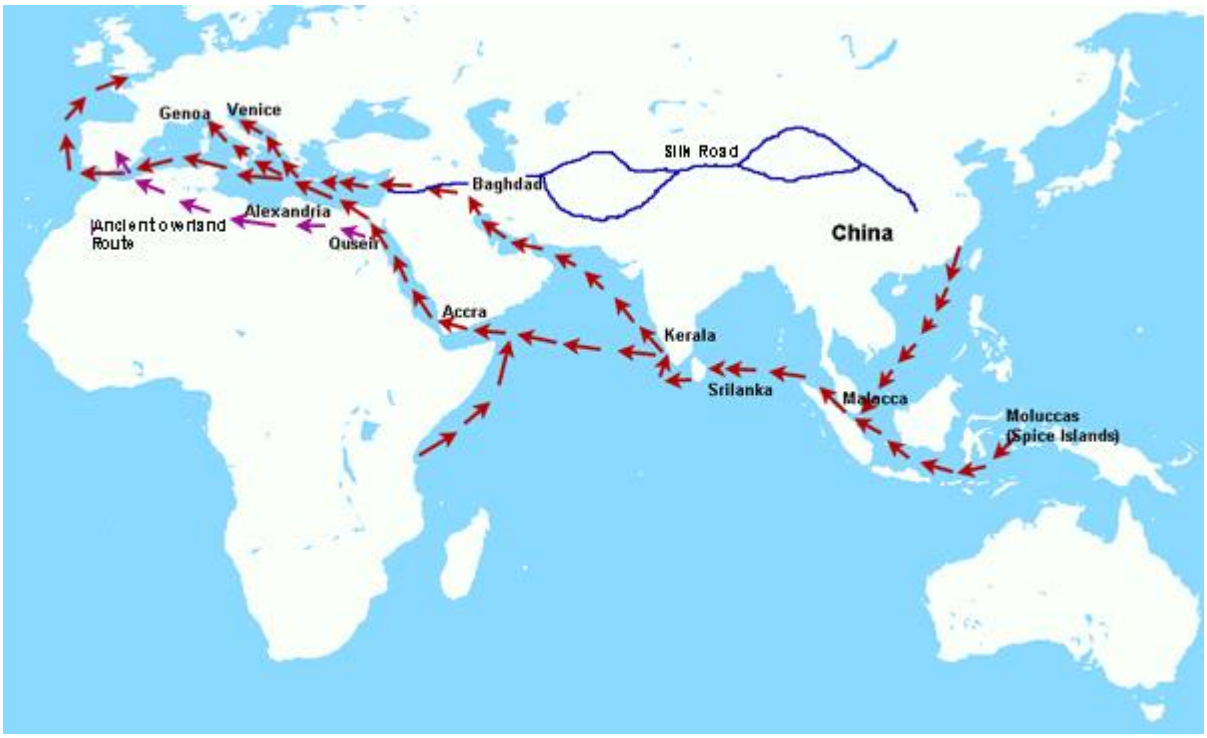
سب سے اہم پیشہ تجارت تھا اور اس کی بنیادی وجہ جزیرہ نما عرب کی لوکیشن تھی۔ جیسا کہ آپ نقشے پر دیکھ سکتے ہیں کہ اس دور کی بین الاقوامی تجارت کے دو راستے تھے: سمندری اور خشکی کا۔ خشکی کے راستوں میں سب سے نمایاں شاہراہ ریشم (Silk Route) تھی جو کہ عرب سے نہ گزرتی تھی لیکن عرب کا مغربی سمندر بحیرہ احمر (Red Sea) آج کل کی طرح اس دور کی بین الاقوامی تجارت میں بھی مرکزی شاہراہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ رومن ایمپائر اور بعض علاقائی طاقتوں نے اپنے زمانے میں اس سمندر کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے اس سمندر سے گزرنے والے پر ٹیکس لگا دیے جس سے نقل و حمل کی لاگت (Cost of Transportation) کافی بڑھ گئی۔ اس سے عربوں کو فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ملک سے گزرنے والا خشکی کا راستہ اہمیت اختیار کر گیا اور بین الاقوامی تجارت نے یہاں فروغ حاصل کیا۔

چین اور ہندوستان اس دور میں بھی بڑے زرعی ممالک تھے۔ اس کے علاوہ یہاں تہذیب کی ترقی کے سبب ہاتھ سے کام کرتے ہوئے چھوٹی صنعتیں عروج پر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے بحری جہاز مال لے کر یمن کی بندرگاہوں پر آتے۔ اسی طرح مشرقی افریقہ کے ممالک سے بھی مال یمن کی بندرگاہوں پر آکر اترتا۔ یہاں سے عرب تاجر اسے خریدتے اور خشکی کے راستے شام (سوریا، لبنان، فلسطین اور اسرائیل) لے جاتے۔ رومی تاجر ان سے یہ مال خرید کر یورپ کی منڈیوں تک پہنچا دیتے۔ دوسری طرف یورپ اور شمالی افریقہ کی زرعی اور صنعتی پراڈکٹس فلسطین میں آکر فروخت ہوتیں جنہیں یہ عرب تاجر خرید لیتے اور یمن میں لا کر فروخت کر دیتے۔ یہاں سے یہ چین، ہندوستان اور مشرقی افریقہ کے ممالک میں چلی جاتیں۔

چونکہ اس دور میں سفر ایک مشکل کام تھا، اس وجہ سے بین الاقوامی تجارت (Global Business) ایک مشکل کام تھا۔ سمندری سفر، خشکی کے سفر کی نسبت آسان اور محفوظ تھا۔ دوسرے ممالک کی اشیا کی ڈیمانڈ، ان کی سپلائی سے ہمیشہ زیادہ رہتی جس کی وجہ سے ان کی قیمتیں اتنی زیادہ ہوتی تھیں کہ تاجر سینکڑوں بلکہ ہزاروں فیصد منافع کماتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بین الاقوامی تجارت میں شرکت ہر عرب کا خواب ہوا کرتا تھا۔

دوسرے اور پہلے ملینیم قبل مسیح (1-1000BC) میں اس تجارت پر یمن کی قوم سبا کا کنٹرول تھا جس کی تفصیل ہم تاریخ میں بیان کر چکے ہیں۔ 250BC-250CE کے زمانے میں اس تجارت پر اردن کی نبطی قوم نے کنٹرول حاصل کر لیا۔ انھوں نے کوئی ایسا طریقہ ایجاد کیا جس کی مدد سے وہ پانی اور خوراک کے بڑے ذخیرے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ یہ لوگ معروف شاہراہوں کی بجائے غیر معروف صحرائی راستوں پر سفر کرتے اور اس طرح عرب قبائل کے حملوں سے محفوظ رہتے۔ رومن ایمپائر نے طاقت حاصل کی تو نبطی زوال پذیر ہو گئے۔[3]

[3] Who were Ancient Arab Traders? http://nabataea.net/who1.html (16 Jan 2013)



بشکریہ: http://www.iro.umontreal.ca/~vaucher/Genealogy/Documents/Asia/EuropeanExploration.html (16 Jan 2013)

عربوں کے ان خشکی کے قافلوں کو سب سے بڑا خطرہ دشمن قبائل کے حملوں کا رہا کرتا تھا۔ حملے کا مطلب یہ تھا کہ ایک قافلے میں جتنی بھی رقم انوسٹ کی گئی ہو، وہ ڈوب جائے۔ بعض قبائل ایسا کرتے تھے کہ ٹیکس لے کر ان تجارتی قافلوں کو اپنے علاقے سے گزرنے دیتے تھے۔ یہ اس لحاظ سے عقل مند تھے کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ایک ہی بار ذبح کرنے کی بجائے اس سے مستقل بنیادوں پر سونے کا انڈا حاصل کرتے تھے۔ اس کے برعکس بعض احمق قبائل اس کو ترجیح دیتے تھے کہ مرغی کو ایک ہی بار ذبح کر لیا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے سے عربوں میں یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ چار ماہ کے لیے جنگ اور قتل وغارت کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ یہ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب کے مہینے تھے جنہیں "الاَشہُر الحُرُم" یعنی مقدس مہینے کہا جاتا تھا۔ تین ماہ حج کے سفر کے لیے اور رجب عمرہ کے لیے تھا اور ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے حکم کے مطابق ان چار مہینوں میں جنگ نہیں ہوتی تھی۔ ان مہینوں کا احترام سبھی عرب پورے مذہبی جوش کے ساتھ کیا کرتے تھے اور اگر کوئی اس حرمت کی خلاف ورزی کرتا تو اسے پورے عرب کے قبائل کی جانب سے مخالفت، بائیکاٹ اور جنگ کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہی وجہ ہے کہ ان مہینوں میں حج کے ساتھ ساتھ تجارتی قافلے بھی محفوظ رہتے اور پورے عرب میں غیر معمولی تجارتی سرگرمیاں ان مہینوں میں فروغ پاتیں۔ داخلی تجارت میں تجارتی میلے اہم کردار ادا کرتے تھے اور یہ میلے بھی زیادہ تر انہی مہینوں میں لگا کرتے تھے۔

حج سے پہلے اور بعد میں متعدد میلے لگتے تھے جن میں عکاظ، ذوالمجاز، نطاۃ خیبر، مجنۃ، حجر الیمامہ زیادہ مشہور ہیں۔[4] سب سے مشہور عکاظ میلہ رہا ہے جو طائف ایئرپورٹ کے قریب ہی آج تک موجود ہے۔

اس تجارت میں اہل مکہ کا حصہ دیگر قبائل کی نسبت کم تھا۔ ان کی معیشت کا انحصار زیادہ تر اس فنڈ پر تھا جو کہ مخیر حاجی، حج کے وقت انہیں بطور عطیات دیتے تھے۔ ان تحفہ میں سے غریب حجاج کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے پر رقم خرچ کی جاتی اور قریش بھی اپنے اخراجات پورے کر لیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قحط اور خشک سالی کے دنوں میں یہ رقم نہ بچتی اور قریش کے غریب گھرانے فاقوں کا شکار ہو جاتے۔ اس زمانے میں ان کے ہاں ایک ہولناک رسم جاری تھی جسے "احتفاد" کہا جاتا ہے۔ جب کوئی خاندان انتہائی غربت اور فاقوں کا شکار ہو جاتا تو یہ خاموشی سے صحرا میں چلا جاتا اور وہاں یہ لوگ بھوک سے یکے بعد دیگرے دم توڑ دیتے۔

اس ہولناک رسم کو جناب ہاشم (d. c. 550) نے ختم کیا جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑدادا تھے۔ انھوں نے ایک زبردست تحریک شروع کی اور اپنے اہل قبیلہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> "اے گروہ قریش! قبیلے کی عزت افراد کی کثرت سے ہوتی ہے۔ اہل عرب میں مال کی فراوانی اور افراد کی کثرت کے اعتبار سے آپ لوگوں کو برتری حاصل ہے لیکن اس احتفاد کی رسم نے آپ کے بہت سے خاندانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ میری ایک تجویز ہے اگر آپ لوگ اسے سنیں۔"
>
> لوگوں نے کہا: "حکم فرمایئے۔ آپ کی ہر تجویز بہت عمدہ ہوتی ہے۔"
>
> ہاشم نے فرمایا: "میرے رائے یہ ہے کہ آپ میں سے جو مفلس اور تنگ دست ہو، انہیں میں دولت مند خاندانوں کے ساتھ اٹیچ کر دوں۔ ہر امیر کے ساتھ ایک غریب کو اس کے خاندان سمیت وابستہ کر دوں۔ جب آپ لوگ اپنے تجارتی کارواں لے کر گرمی اور سردی میں (بالترتیب) شام اور یمن کی طرف جائیں تو آپ کے یہ غریب بھائی آپ کی مدد کریں۔ پھر جب اس کاروبار میں آپ کو پرافٹ ہو تو اس پرافٹ میں ان غریبوں کو بھی پارٹنر بنا لیجیے تاکہ یہ آپ کے تحت عزت اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں۔ فاقہ کشی کے باعث انہیں مرنے کی نوبت نہ آئے۔ اس طرح احتفاد کی رسم ختم ہو جائے گی۔"
>
> سب لوگوں نے اس رائے کو بہت پسند کیا۔ ہاشم نے ہر امیر کے ساتھ ایک مفلس خاندان کو اٹیچ کر دیا اور اس حکمت عملی سے ساری قوم کو ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا کر دیا۔[5]

جناب ہاشم کی ان کاوشوں سے قبیلہ قریش کی معاشی قوت میں بہت اضافہ ہوا۔ انھوں نے باقاعدگی سے موسم گرما میں فلسطین اور موسم

---

[4] محمود شکری الوسی بغدادی۔ بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ http://archive.org/details/oul_oulourelirb (16 Jan 2013)

[5] محمد بن یوسف صالحی دمشقی (d. 942/1535)۔ سبیل الہدی والرشاد فی سیرۃ الخیر العباد۔ 1/317۔ (بحوالہ ازہری 1/440)

سرما میں یمن کے سفر شروع کر دیے۔ امیر لوگوں کو، جو کہ قافلے لے جایا کرتے تھے، کام کرنے والے محنتی کارکن مل گئے اور غربا کو روزگار مل گیا۔ خانہ کعبہ سے تعلق کی وجہ سے قریش کو تمام عرب قبائل عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور حج کی وجہ سے قریش کے ان میں سے اکثر قبائل سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس وجہ سے ان کے تجارتی قافلوں سے کوئی ڈکیتی نہیں کی جاتی تھی۔

جب قریش کے قافلے محفوظ ہوئے تو کم خطرہ اور زیادہ پرافٹ کی وجہ سے دیگر قبائل کے لوگ بھی قریش سے پارٹنرشپ کر کے ان کے قافلوں میں انوسٹمنٹ کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ہی عرصے میں مکہ مکرمہ پورے عرب کا معاشی مرکز بن گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے قریش ایک خوشحال ترین قبیلہ تھا اور مکہ کو عالم عرب کے معاشی مرکز کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اسی کو موضوع بناتے ہوئے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ. إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ. فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ. الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ.

قریش میں محبت پیدا کرنے کے ذریعے، ان میں سردیوں اور گرمیوں میں سفر کی محبت پیدا کرنے کی وجہ سے، انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور (تجارتی قافلوں کو لاحق) خطرات سے امن نصیب کیا۔ (القریش 106)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بزنس اور عائلی زندگی (583-609CE)

بنو ہاشم کی فیملی میں ان کے پوتے ابو طالب ایک بزنس مین تھے۔ اس لیے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اسی کام پر اپنے ساتھ لگا لیا۔ کم عمری میں آپ نے بکریاں بھی چرائیں کیونکہ آپ اپنے چچا پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے۔ 12 برس کی عمر میں آپ نے اپنے چچا کے ساتھ شام اور فلسطین کا سفر کیا جہاں ایک عیسائی اسکالر بحیرہ نے آپ کو دیکھ کر پیش گوئی کی کہ آپ آخری نبی ہوں گے۔

ابو طالب، تجارت کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ان کا کاروبار حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سنبھالا کرتے تھے۔ اس عملی تجربہ کے سبب آپ اوائل جوانی میں ایک ماہر بزنس مین بن چکے تھے اور قریش کے قافلوں میں مال لے جایا کرتے تھے اور آپ کی حیثیت ایک نہایت ہی دیانت دار تاجر کی تھی۔ ایسے ہی ایک سفر میں قریش کی ایک دولت مند، پاک دامن اور نیک خاتون سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے تجارتی پارٹنرشپ کی۔ اس پارٹنرشپ میں آپ کی امانت و دیانت سے متاثر ہو کر سیدہ خدیجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نکاح کا پیغام بھیجا جسے آپ اور آپ کے چچا نے خوشی سے قبول کر لیا۔

یہ نکاح 596CE میں ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 25 برس اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر 28 برس کی تھی۔[6] سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بچوں کی پیدائش کے سالوں کو مد نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جن روایات میں 40 سال عمر ہے تو اس

[6] حاکم۔ المستدرک علی الصحیحین۔ کتاب معرفۃ الصحابہ۔ حدیث 4903۔ قاہرہ: دار الحرمین۔

میں غلطی ہے۔ اس موقع پر جناب ابو طالب نے اس شادی پر جو خطبہ دیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے معاشرے میں کیا مقام حاصل تھا:

الحمدُ لله الذی جَعَلَنَا مِن زَرعِ إبراهيمَ وذُرِيَّةِ إسْماعيلَ، وجعل لنا بَلَدًا حَرَامًا وبَيتًا مَحجُوجًا وجعلَنا الْحكامَ على الناسِ. ثُم إنّ مُحمدَ بن عبدِ الله ابنُ أخِی مَن لا يُوَازِنُ به فتًى من قريشٍ إلاّ رَجَحَ عليه بِرًّا وفضلاً و كَرمًا وعَقلا ومَجدًا ونُبلاً. وإن كان فِي الْمالِ قَلُّ، فإنّما الْمالُ ظَلُّ زائل.

اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں ابراہیم اور اسماعیل (علیہما الصلوۃ والسلام) کی اولاد سے بنایا۔ اور اس شہر کو ہمارے لیے محترم بنایا اور یہاں وہ گھر بنایا جس کی جانب حج کیا جاتا ہے اور ہمیں لوگوں پر حکمران بنایا۔ اس کے بعد میں یہ کہنا چاہوں گا کہ محمد بن عبد اللہ، جو میرے بھائی کے بیٹے ہیں اور ان کا موازنہ قریش کے کسی بھی نوجوان سے کیا جائے تو ان کا پلڑا بھاری ہو گا۔ نیکی، فضل، کرم، عقل، احترام اور شرف میں انہیں سب پر ترجیح حاصل ہے۔ اگرچہ ان کے پاس مال کم بھی ہو مگر مال تو محض ڈھلنے والا سایہ کی طرح ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوجوانی ہی میں اپنے معاشرے میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور اپنے معاشرے کے صالح افراد میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کو "صادق" اور "امین" کا لقب دیا گیا جس کا سبب آپ کا اعلی اخلاقی معیار تھا۔ شادی کے بعد آپ تجارت کرتے رہے اور اس دوران عرب کے مختلف تجارتی میلوں میں آپ کو جانے کا موقع ملا۔ شام، یمن اور عمان کے متعدد سفر آپ نے کیے۔ عمان کے تجارتی میلے میں آپ نے ہندوستان کے باشندے بھی دیکھے۔ بعض سیرت نگاروں کا خیال ہے کہ آپ حبشہ (موجودہ ایریٹیرا اور سوڈان) بھی تشریف لے گئے اور وہاں کے بادشاہ نجاشی سے آپ کے دوستانہ مراسم تھے۔[7]

تجارت میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیگر لوگوں سے بھی پارٹنر شپ کی اور تجارتی معاملات میں اس درجے کی دیانت داری کا مظاہرہ فرمایا کہ آپ کے ایک بزنس پارٹنر قیس بن سائب مخزومی رضی اللہ عنہ اعلان نبوت کے بعد آپ پر اسی دیانت داری کے سبب ایمان لے آئے۔[8]

کعبہ کی تعمیر نو(605CE)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک 35 برس ہوئی تو کعبہ کی تعمیر نو کی گئی۔ یہ واقعہ 605 کے لگ بھگ پیش آیا۔ مختلف قبائل نے اس تعمیر میں حصہ لیا کیونکہ کعبہ سبھی کے نزدیک محترم تھا۔ جب حجر اسود کو نصب کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو ہر قبیلے کی خواہش تھی کہ یہ شرف انہی کے حصے میں آئے۔ چار دن تک اس پر بحث ہوتی رہی تو ان کے درمیان جنگ چھڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر ایک قریشی بزرگ ابو امیہ بن مغیرہ کے مشورے پر اتفاق ہوا کہ کل صبح جو شخص خانہ کعبہ میں داخل ہو، تو وہی اس اختلاف کا فیصلہ کرے گا۔

---

[7] محمد حمید اللہ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ص23۔ ملتان: بیکن بکس۔

[8] شبلی نعمانی۔ ایضا۔ 1/124۔

اگلے دن جو شخص سب سے پہلے خانہ کعبہ میں آیا تو وہ محمد بن عبد اللہ تھے اور انہیں دیکھ کر سب قبائل کے نمائندے خوش ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسمل نے اس مقدمے کا فیصلہ یہ کر دیا کہ ایک چادر پر حجر اسود کو رکھا اور تمام قبائلی نمائندوں کو اسے اٹھانے کا حکم دیا۔ پھر ان سب کی مدد سے آپ نے حجر اسود کو نصب کر دیا اور سبھی قبائل اس فیصلے سے خوش ہو گئے کہ انہیں یہ سعادت نصیب ہوئی تھی۔[9] ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے معاشرے میں انتہائی اعلی مقام رکھتے تھے۔ اعلان نبوت سے پہلے آپ کے اخلاق و کردار کو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

كلا والله ما يخزيك الله أبدا، إنك لتصل الرحم، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقرى الضيف، وتعين على نوائب الحق.

ہر گز نہیں۔ اللہ آپ کو کبھی رسوانہ کرے گا۔ آپ توصلہ رحمی کرتے ہیں، ہر شخص کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں کو کما کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی راہ میں مشکلات بھی برداشت کرتے ہیں۔[10]

توحید اور شرک کی تاریخ(2000BC-605CE)

اعلان نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے مذہب سے بیزار تھے اور بتوں کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ شرک یا یہ مذہب تو بعد میں ایجاد ہوا تھا۔ قریش کے تمام لوگ ہی حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام کی نسل سے تھے جس میں اصل ایمان توحید کی بنیاد پر تھا۔ توحید کی دعوت 2000BC سے جاری تھی اور قریش لے لوگ توحید پر قائم تھے۔ نماز، روزہ، زکوۃ، قربانی اور حج کی عبادت جاری تھی اور وہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے 2400 سال بعد جا کر 400CE میں کسی مشرکانہ عادت قریش میں بھی آنی شروع ہوئی۔

عرب میں بت پرستی کو عمرو بن لحی خزاعی (c. 350-450) نے فروغ دیا۔ یہ شخص بنو خزاعہ قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور اسے قصی بن کلاب سے پہلے مکہ میں اقتدار حاصل تھا۔ اسے کوئی سنگین مرض لاحق ہوا۔ کسی نے اسے مشورہ دیا کہ شام میں بلقاء کے مقام پر ایک چشمہ ہے، وہاں غسل کرو تو صحت یاب ہو جاؤ گے۔ یہ وہاں گیا تو غسل کر کے صحت یاب ہو گیا۔ اس چشمے کے ساتھ ہی ایک مجسمہ تھا، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ عام طور پر چشموں کے ساتھ بت کدے یا مزارات تعمیر کر لیے جاتے ہیں اور یہ مشہور کر دیا جاتا ہے کہ اس پانی میں شفا فلاں دیوتا یا فلاں بزرگ کی دعا کے سبب ہے۔

اپنی شفا کے سبب یہ عمرو بن لحی خزاعی ان مشرکین کے مذہب سے متاثر ہوا اور ان سے بت لے کر عرب میں آیا اور انہیں بھی ان کی عبادت کی دعوت دی۔ چونکہ یہ صاحب اثر و رسوخ تھا اور رفاہی کام بہت کرتا تھا، اس لیے اس کی دعوت کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس

---

[9] شبلی نعمانی۔ ایضا۔ 1/126۔

[10] محمد بن اسماعیل البخاری۔ الجامع الصحیح۔ حدیث 3۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔

کی جود وسخا کا عالم یہ تھا کہ یہ موسم حج میں 10,000 اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھانا کھلاتا اور 10,000 لوگوں کو لباس دیتا جو کہ اس دور کے عرب میں ایک قیمتی چیز تھی۔[11] ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ عمرو بن لحی خزاعی کی دعوت کی مقبولیت میں اس کی جود وسخا کے ساتھ ساتھ مشرک اقوام کے اثرات کو بھی دخل رہا ہو گا۔

جب شرک پھیلا تو ہر قبیلے نے اپنا اپنا دیوتا تخلیق کر لیا اور اس کی پوجا کرنے لگے۔ قریش نے عربوں میں اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھنے کے لیے یہ کام کیا کہ حج کے لیے آنے والے سبھی قبائل کے بتوں کا ایک ایک سمپل خانہ کعبہ یا اس کے ارد گرد نصب کر دیا اور عہد نبوی تک ان کی تعداد 360 تک پہنچ گئی۔ یہ بت صنم (جمع اصنام) یا وثن (جمع اوثان) کہلاتے تھے۔ بعض مجسمے عرب میں مشہور تھے جن کی تفصیل یہ ہے:

- **ہبل:** یہ خانہ کعبہ میں سب سے بڑا مجسمہ تھا اور اس سے فال گیری کی جاتی تھی۔
- **منات:** یہ ساحلی شاہراہ پر مکہ سے 100 کلو میٹر دور قدید کے مقام پر نصب تھا۔ ان کے تصور میں یہ ایک دیوی تھی۔
- **لات:** اس کا مرکزی آستانہ طائف میں تھا۔
- **عزی:** یہ بھی ایک دیوی تھی جس کا مرکزی آستانہ وادی النخلہ میں تھا۔ منات، لات اور عزی کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔
- **ود، یعوق، یغوث، سواع اور نسر:** ان پانچ مجسموں کا ذکر بھی قرآن مجید میں آیا ہے اور یہ قوم نوح کے بت تھے جن کی پرستش عربوں نے بھی شروع کر دی تھی۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان بتوں سے متعلق کچھ نہ کچھ روایتیں قصے کہانیوں کی شکل میں ان تک پہنچی ہوں گی۔[12]
- **حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام:** ان انبیا کی تصاویر بھی خانہ کعبہ میں آویزاں تھیں اور ان کی تعظیم کی جاتی تھی۔ توحید کا پیغام پہنچانے والے بزرگوں کے ساتھ یہ معاملہ پوری تاریخ میں رہا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو بھی نبی یا کوئی نیک آدمی تھے، انہی کی تصاویر اور مجسمہ بنا کر پوجا شروع ہوئی۔ عربوں کے ہاں یہ تصور موجود تھا کہ یہ بت دراصل علامت ہیں اور ان کے پیچھے کچھ روحانی قوتیں موجود ہیں جنہیں وہ "الہ (god)" یا دیوتا کہتے تھے۔ ان کے خیال میں ان دیوتاؤں کی ایک مخروطی تنظیم (Hierarchy) موجود تھی اور سب سے اوپر جو عظیم خدا تھا، اسے وہ "ال الہ (The God)" یا "اللہ" کہتے تھے۔ بعض مشرکین سورج، چاند اور ستاروں کو بھی دیوتا مان کر ان کی عبادت کرنے لگے۔ بعض مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالی کی بیٹیاں سمجھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بیٹیاں اپنے باپ سے جو چاہیں، منوا سکتی ہیں۔ مختلف بتوں کے آستانے یا

---

[11] علی بن برہان الدین الحلبی (بحوالہ ازہری)۔ سیرۃ الحلبیہ۔ 1/12۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔

[12] زہری۔ ایضا۔ 1/315-317

معبد پورے عرب میں پائے جاتے تھے جنہیں ''نُصُب (جمع انصاب)'' کہا جاتا تھا۔ ان آستانوں پر جانور قربان کیے جاتے اور بسا اوقات زندہ جانور بھی ان کے لیے وقف کر دیا جاتا۔

شرک کے لازمی نتیجہ کے طور پر عربوں میں توہم پرستی عام ہو گئی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تیروں سے فال لینا ان کے ہاں عام تھا اور یہ تیز ''ازلام'' کہلاتے تھے۔ بارش کے لیے گائے کی دم سے جھاڑی باندھ کر اسے آگ لگا دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کے بعد اسے سواری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ لوگ مرنے والے کے اونٹ کی گردن باندھ دیتے اور اسے ایک گڑھے میں بھوکا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ کہیں وبا پھیلتی تو وہاں داخل ہونے سے پہلے گدھے کی طرح آواز نکالتے اور پھر خرگوش کے ٹخنے کی ہڈی گلے میں باندھ لیتے۔ سفر پر جاتے تو ایک دھاگہ کسی پر باندھ جاتے۔ اگر واپسی پر وہ صحیح سلامت ملتا تو سمجھ لیتے کہ ان کی بیوی پاکدامن رہی ہے اور اگر ٹوٹا ہوا ملتا تو یہ سمجھتے کہ بیوی نے بدکاری کی ہے۔[13]

مشرکین کی بڑی تعداد حیات بعد الموت اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک انسان جب مر کر مٹی میں مل جاتا ہے اور اس کی ہڈیاں الگ ہو جاتی ہیں، تو اسے کیسے دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے؟ قرآن کے مطابق یہ سوال بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یہ مشرکین پیش کیا کرتے تھے اور آپ اس کا جواب دیتے کہ جس اللہ تعالی نے انسان کو پہلی بار بنا لیا، اس کے لیے مشکل نہیں ہے کہ وہ دوسری بار ایسا کرے۔

اکثر مشرکین نبوت و رسالت پر ایمان رکھتے تھے اور حضرت آدم، نوح، ابراہیم اور اسماعیل علیہا الصلوۃ والسلام کو اللہ تعالی کا سچا پیغمبر مانتے تھے۔ قرآن مجید کے اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل بالخصوص حضرت موسی، داؤد، سلیمان اور عیسی علیہا الصلوۃ والسلام کو بھی اکثر عرب مشرکین سچا پیغمبر مانتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہا الصلوۃ والسلام کے ارشادات کی بنیاد پر توحید میں قائم رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی شرک کی طرف نہیں گئے۔ قریش میں بعض لوگ توحید پر قائم تھے اور مشرکانہ توہم پرستی سے بچے ہوئے تھے۔ اس لیے جب نبوت کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر یہی لوگ جلدی سے ایمان لائے اور انہیں قرآن مجید میں سابقون الاولون کہا جاتا ہے۔

نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی علمی و فکری اور تہذیبی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔ نہ آپ کتب پڑھتے اور لکھتے تھے، نہ آپ کو شاعری میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اعلان نبوت سے پہلے آپ کے کوئی خطبات مشہور ہوئے۔ اگرچہ آپ بنو سعد میں پرورش کے سبب نہایت عمدہ اور فصیح و بلیغ عربی بولتے تھے لیکن کسی علمی و فکری سرگرمی کا کوئی سراغ آپ کی زندگی میں نہیں ملتا۔ آپ قبیلہ قریش کے ایک صالح نوجوان تھے جو نیکی کے شائق تھے، غربا اور مظلوموں کی مدد کیا کرتے تھے اور صرف ایک ہی خدا اللہ تعالی کی عبادت کیا کرتے تھے۔

---

[13] ایضا۔ 1/348-352

اگر وحی کا سلسلہ شروع نہ ہوتا تو اس معاشرے کے ایک صالح فرد کی حیثیت سے ہی محمد بن عبداللہ بقیہ زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے لیکن اللہ تعالی نے آپ کو انسانیت کے لیے اہم ترین مشن کے لیے منتخب فرمالیا اور اسی وجہ سے آپ کو ایک غیر مسلم مفکر مائیکل ہارٹ نے پوری انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ موثر شخصیت قرار دیا ہے۔[14]

[14] Hart, Micheal H. ***The 100. A Ranking of the Most Influential Persons in History.*** P. 3. New York: Carol Publishing Group Edition (1993).

باب 2: اعلان نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں دعوت دین (609-622CE)

سیرت طیبہ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن میں 35 برس کی عمر کے بعد سوالات پیدا ہونے لگ گئے تھے اور آپ عبادت کی طرف زیادہ مائل ہونے لگے تھے۔ اس دور کی روایت کے مطابق آپ نے عبادت کے لیے شہر سے باہر ایک غار کا انتخاب فرمایا اور وہاں جا کر آپ کئی کئی دن عبادت اور غور و فکر کیا کرتے تھے۔ یہ سوالات اس ماحول سے پیدا ہوئے ہوں گے کیونکہ اہل مکہ کی اکثریت شرک کو مذہب اور توہم پرستی اختیار کر چکے تھے جبکہ ان کے سب سے بڑے نبی ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا دین توحید تھا جس سے کانفلکٹ (Conflict) جیسی شکل ہو چکی تھی جس سے بہت سے سوالات جاری ہو رہے تھے۔

اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن میں کچھ سوالات کا جواب تلاش کر رہے تھے اور اس سلسلے میں ایسے لوگوں سے بات چیت بھی کیا کرتے تھے جو توحید کے قائل تھے۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت زید بن عمرو بن نفیل (d. 605CE) تھے جو عرب کے ایک توحید پرست انسان تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح بت پرستی سے بے زار تھے۔ اپنے سفر میں وہ اہل کتاب سے گفتگو کرتے تھے اور مشرکین کی توہم پرستی سے متعلق سوالات سامنے رکھتے تھے اور پھر انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی روایات پر قائم رہتے تھے۔

پہلی وحی اور دعوت کا ابتدائی دور (609-612CE)

غار حرا میں عبادت کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ مشہور روایت کے مطابق سب سے پہلے سورۃ العلق کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ حضرت جبرئیل علیہ الصلوۃ والسلام وحی لائے اور انہوں نے آپ سے پڑھنے کے لیے کہا۔ آپ نے فرمایا: ''میں پڑھ نہیں سکتا۔'' انہوں نے آپ کو سینے سے لگا کر بھینچا اور یہ عمل تین مرتبہ کیا۔ اس کے بعد آپ یکایک پڑھنے لگے اور یہ آیات نازل ہوئیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ. اقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ. خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ. اقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ. الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ. عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ.

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے کیونکہ اس کی شفقت ہمیشہ کے لیے ہے۔(اے رسول!)اس رب کے نام سے انہیں پڑھ کر (قرآن مجید)سنا دیجیے کہ اپنے رب نے جمے ہوئے خون جیسے ایک لوتھڑے سے انسان کو پیدا کیا ہے۔انہیں پڑھ کر سنا دیجیے کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا رب بہت بڑا ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے (یہ قرآن) آپ کو سکھا دیا ہے۔انسان کو (اس میں) وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔(العلق 96:1-5)

دیگر روایات میں یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے سورۃ الفاتحہ نازل ہوئی کیونکہ اس وقت مخلص انسان اللہ تعالی سے ڈیمانڈ کر رہے تھے کہ وہ ہدایت حاصل ہو جائے تاکہ ہم غلطیوں سے بچ سکیں کیونکہ عرب ممالک میں زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے جبکہ صرف اہل کتاب ہی تعلیم یافتہ تھے اور ان کے ہاں بھی بہت سی گمراہیاں آچکی تھیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيمِ. الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِينَ۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيمِ. مَالِكِ يَوۡمِ الدِّينِ۔ إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ۔ اهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيمَ۔ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّالِّينَ۔

اللہ کے نام سے آغاز کہ وہی رب حقیقتاً رحمت عنایت فرمانے والا ہے اور اس کی ہمدردی ہمیشہ کے لیے ہے۔شکر اور تعریف اللہ تعالی ہی کے لیے ہے جو پوری یونیورس کا رب ہے۔اس کی کنفرم رحمت ہے جس کی شفقت ہمیشہ کے لیے ہے۔وہی رب (موجودہ زندگی کے) فائنل رزلٹ کے دن کا مالک ہے۔(اے رب!) ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ سے ہی مدد مانگ رہے ہیں۔مجھے سیدھی راہ کی ہدایت عنایت فرما دیجیے۔(یہ ہدایت صرف) انہی لوگوں کا راستہ سمجھا دیجیے جن پر آپ نے عنایت فرماتے رہے ہیں۔ان لوگوں کے راستے (سے جان چھڑا لیجیے) جن پر آپ کا غضب آیا تھا یا وہ لوگ جو ہدایت سے گمراہ ہوتے رہے ہیں۔(سورۃ الفاتحہ 1)

ان دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ اور سورۃ العلق دونوں ہی شروع میں نازل ہوئیں۔اس کے متن کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہدایت کے لیے جو ڈیمانڈ تھی، اسی کا جواب اللہ تعالی نے دیا کہ آپ کے لیے قرآن مجید نازل ہو رہا ہے تاکہ آپ ہدایت کو حاصل کر سکیں۔اس وقت شرک موجود تھا جبکہ اہل کتاب کے پاس تورات اور انجیل موجود تھی لیکن ان کے ہاں بھی فرقہ واریت آچکی تھی اور گمراہیوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔

ان آیات کے نزول کے ساتھ ہی اس عظیم علمی و فکری سرگرمی کا آغاز ہوا، جس نے انسانیت کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ الصلوۃ والسلام کی اس آمد کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کے تحمل کے لیے تیار کرنا تھا، باقاعدہ وحی کا سلسلہ بعد میں جاری ہوتا رہا کہ ہر موقع پر سورتیں نازل ہوتی رہیں۔[15] ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کی ہر سورت کا فارمیٹ یہ ہے کہ اللہ تعالی لیکچر کی طرح انسانوں کو سمجھا رہا ہے۔اس وقت جو سوالات پیدا ہوئے تو اس کا جواب بھی اسی سورت میں

[15] خالد مسعود۔101-103

نازل ہوا ہے۔

معروف روایات کے مطابق اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس گھر آئے اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اپنی دعوت پیش کی جنہوں نے فوراً اسے قبول کر لیا۔ آپ کے اہل خانہ میں آپ کی بیٹیاں، منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ اور کزن حضرت علی رضی اللہ عنہم نے اسلام قبول کیا۔ حضرت علی اس وقت بچے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر کفالت تھے۔ بالغ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جن کے ساتھ آپ کی بچپن کی دوستی تھی اور وہ خود بھی عرب معاشرے میں نہایت ہی معزز مقام رکھتے تھے۔ اس طرح سے ایک ابتدائی مسلم کمیونٹی وجود میں آنے لگی۔

قرآن مجید کے نزول کا سلسلہ جب شروع ہوا تو اس کی ابتدائی تعلیمات یہ تھیں کہ صرف اور صرف ایک اللہ کو مان لیا جائے، بت پرستی نہ کی جائے، دین ابراہیمی کی شریعت کے مطابق نماز پڑھی جائے، غربا و مساکین کی مدد کی جائے اور اعلی انسانی اخلاقیات کی پیروی کی جائے۔ عرب لوگ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام کی امت کے طور پر تھے اور شریعت کو جانتے تھے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس میں اگرچہ غلطیاں ہو رہی تھیں لیکن پھر بھی مخلص لوگ کافی حد تک وہ شریعت پر عمل کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ عربوں میں اہل کتاب یہودی اور عیسائی موجود تھے جن کے پاس تورات، زبور اور انجیل موجود تھی اور اس کے مخلص لوگ حضرت ابراہیم اور اسحاق علیہما الصلوۃ والسلام کی امت کے طور پر موجود تھے۔

قرآن مجید نے ابتدائی ایام ہی میں عقیدہ آخرت کو نہایت تفصیل سے مختلف اسالیب میں بیان کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کی بڑی تعداد عقیدہ آخرت کو بھلا چکی تھی اور یہ لوگ مرنے کے بعد زندگی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ تعالی کے حضور جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اس کے ساتھ عربوں میں اہل کتاب تعلیم یافتہ تھے جو آخرت کو مانتے تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے نیک بزرگ آخرت میں ہمارے گناہ ڈیلیٹ کر کے ہمیں جنت میں پہنچا دیں گے۔ ابھی ہم قرآن مجید کی آخری سورتوں کا مطالعہ کریں تو اس میں یہی موضوع نظر آتا ہے۔

ابتدائی برسوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو محدود مخلص لوگوں تک پہنچایا اور ان کی غالب اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی وہ لوگ تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست و بازو بنے اور قرآن مجید میں انہیں سابقون الاولون کہا گیا یعنی وہ تیزی سے جلد ایمان لائے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اس معاشرے میں بہت عزت تھی اور آپ کی دعوت کے نتیجے میں حضرت عثمان، طلحہ، زبیر، عبد الرحمن، سعد اور بہت سے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ایمان لائے۔[16] اس ابتدائی دور میں جن صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کیا، انہیں قرآن مجید میں "السابقون الاولون" کہا گیا ہے:

[16] شبلی، 1/128۔ الازہری، 2/233۔

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ.

مہاجرین اور انصار میں سب سے پہلے جن لوگوں نے ایمان لانے میں سبقت کی، اور وہ جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی پیروی کی، تو اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس رب سے خوش ہوئے۔ اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔(التوبہ 9:100)

اہل مکہ کے ان سابقون الاولون میں حضرت ابو بکر، علی، زید بن حارثہ، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد، ابوعبیدہ، عمار بن یاسر اور ان کے والدین، بلال، خباب بن ارت، سعید بن زید، عبد اللہ بن مسعود، عثمان بن مظعون، عبیدہ بن حارث، صہیب، ابو سلمہ اور جعفر طیار رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ خواتین میں سیدہ خدیجہ، سیدہ زینب بنت رسول اللہ، فاطمہ بنت خطاب، ام سلمہ، ام حبیبہ، سمیہ اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہن نمایاں تھیں۔ یہ مشہور صحابہ ہیں ورنہ مزید اور صحابہ بھی ایمان لا چکے تھے لیکن ان کے نام مشہور نہیں ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر صحابہ کی عمریں 30 سال سے کم تھیں اور بعض 40-30 سال کے درمیان کی عمر کے تھے۔ تین سال کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں یہ تعداد 40 تک پہنچ گئی۔ قریش کے سرداروں کو ان کی سن گن مل گئی تھی مگر انہوں نے زیادہ تفتیش نہیں کی کیونکہ انہوں نے ان لوگوں کو دین حنیفی کے پیروکار سمجھا جو پہلے سے توحید کے قائل تھے۔[17] دین حنیفی سے مراد وہ لوگ تھے جو شرک کو پسند نہیں کرتے تھے اور فطرت کے ساتھ اللہ تعالی کی توحید پر قائم تھے۔

بڑے پیمانے پر دعوت دین کا دور (612CE کے بعد)

تین سال بعد 612CE میں اللہ تعالی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی دعوت کو عام کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے **وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ** "اپنے قریبی رشتے داروں کو وارننگ کر لیجیے۔" کے حکم کے تحت سب سے پہلے اپنے خاندان بنو ہاشم کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ اس موقع پر ابو لہب، جو آپ کا سگا چچا تھا، تو اس نے اس دعوت کی شدید مخالفت کی جبکہ سوتیلے چچا ابو طالب نے آپ کی حمایت کی اور آپ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ ابو طالب چونکہ اس وقت بنو ہاشم کے سربراہ تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے ایک طاقتور خاندان کی حمایت حاصل ہو گئی۔ اس وقت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً اعلان کر دیا تو رشتے داروں نے انہیں مذاق کیا کہ یہ پتلا سا لڑکا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اب قریش کے تمام لیڈرز کو کوہ صفا پر جمع کیا۔ قریش کے ہاں اس پہاڑی کی اہمیت یہ تھی کہ جب

[17] صفی الرحمن مبارک پوری۔ الرحیق المختوم۔ ص 111۔

کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو ایک شخص برہنہ ہو کر اس پہاڑی پر چڑھ جاتا اور سب کو چیخیں مار کر پکارتا۔ جب لوگ اکٹھے ہوتے تو وہ شخص انہیں وارننگ کر دیتا کہ یہ یہ خطرہ آرہا ہے۔ اس شخص کو "النذیر العریان (ننگا وارننگ کرنے والا)" کہا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عربوں کی اس روایت پر یہی طریقہ اختیار کیا مگر برہنہ ہونے کی بے ہودگی نہیں کی کیونکہ آپ شرم وحیا کے پیکر تھے۔ اس موقع پر آپ نے یہ سوال کیا: "اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے دوسری طرف شہسواروں کی ایک فوج ہے جو آپ پر حملہ کرنا چاہتی ہے تو کیا آپ اسے مان لیں گے؟" ان سب نے بیک زبان کہا کہ ضرور مانیں گے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور آپ تو صادق وامین ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: "میں آپ لوگوں کو ایک سخت عذاب سے وارننگ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔" اس پر ابولہب نے آپ سے گستاخی اور تلخ کلامی کی۔[18]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بخاری کی روایت میں راوی نے بات کو مختصراً بیان کیا ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ تفصیل بیان فرمائی ہو گی اور قریش کو بالکل ویسے ہی عذاب کی خبر دی ہو گی جیسا کہ اس سے پہلے قوم نوح، عاد، ثمود اور فرعون پر آچکا تھا۔ اللہ تعالی کا اصول یہی رہا کہ ہر بڑی قوم پر اللہ تعالی نے انہی کے مخلص انسان کو اپنا رسول قائم کیا۔ پھر یہ رسول اپنے قوم کو توحید، آخرت، شریعت اور تعلیم شخصیت کی دعوت دیتے اور انہیں بتا دیتے کہ آخرت میں جزا و سزا کا سلسلہ ہونا ہے تو موجودہ زندگی میں اس قوم میں بھی جزا و سزا کو پریکٹیکل کر کے دکھایا جائے گا تاکہ دیگر اقوام کو معلوم ہو جائے کہ آخرت حقیقت میں آنے والی ہے۔

اس وجہ سے قریش سردار بھڑک اٹھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سیاسی اور عسکری لیڈرز میں تکبر تھا اور وہ شرک کو اپنا دین سمجھ چکے تھے۔ اب انہیں غصہ آیا کہ اگر شرک کے خلاف کوئی بات کی تو ہماری لیڈرشپ خراب ہو جائے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی حکومت بن جائے گی۔ اس طرح تو ہماری لٹیا ڈوب جائے گی اور ہماری حیثیت ختم ہو جائے گی۔ اس لیے وہ مخالفت کرنے لگے۔ پہلے تو انہوں نے اپنے منہ سے تنقید شروع کی لیکن پھر جو صحابی ان کے قابو میں آئے تو جسمانی تشدد بھی شروع کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اب کھلی تبلیغ شروع کر دی اور گلی کوچوں، محفلوں، میلوں اور ہر موقع پر آپ اپنی دعوت پیش کرنے لگے۔[19] اس دعوت کا طریقہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی آیات کی تلاوت فرماتے۔ ان آیات کی فصاحت و بلاغت اس درجے کی تھی کہ عرب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے کیونکہ وہ بہترین طرز کی خطابت اور شاعری سننے کے عادی تھے اور قرآن مجید نے ان دونوں اصناف سخن کی خوبیوں کو یکجا کر کے ایسے درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا کہ اس کی کوئی مثال بڑے سے بڑے عرب شاعر یا خطیب کے ہاں نہیں ملتی تھی۔

---

[18] بخاری۔ کتاب التفسیر۔ حدیث 4492

[19] قاضی سلیمان منصور پوری۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔ 1/81۔ فیصل آباد: مرکز الحرمین الاسلامی۔

عرب چونکہ ادبی تنقید کے عادی تھے، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ یہ کلام فی الواقع غیر معمولی ہے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ قرآن سنتے تو مسحور ہو کر رہ جاتے اور ان میں سے بعض اتنے متاثر ہوتے کہ ایمان لے آتے۔ ایک مشہور لیڈر ولید بن مغیرہ المخزومی ایمان نہ لایا لیکن اس کا قول مشہور ہے۔

"بخدا، تم میں سے کوئی شخص مجھ سے بڑھ کر نہ شعر سے واقف ہے، نہ رجز اور قصیدہ سے اور نہ جنات کے الہام سے۔ خدا کی قسم! یہ کلام جو اس شخص (محمد) کی زبان سے جاری ہے، ان میں سے کسی چیز سے مشابہ نہیں۔ بخدا، اس کلام میں بڑی حلاوت اور اس پر بڑا رونق ہے۔ اس کی شاخین ثمر بار ہیں۔ اس کی جڑیں شاداب ہیں۔ یہ لازماً غالب ہو گا، اس پر کوئی چیز غلبہ نہ پا سکے گی۔ اور یہ اپنے نیچے ہر چیز کو توڑ ڈالے گا۔" (السیرہ النبویہ لابن کثیر 1/499)

شروع کے کچھ عرصے تک مشرکین مکہ کی مخالفت ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھی لیکن اس کے بعد انہوں نے بھرپور اور منظم مخالفت شروع کر دی جس کا خلاصہ یہ ہے:

- مذاق اڑانا اور ذہنی طور پر ٹارچر کرنا۔
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف جھوٹا پراپیگنڈا کرنا۔
- قرآن مجید پر اعتراضات کرنا۔
- قرآن مجید کے مقابلے پر روم و ایران کے قصے پیش کرنا اور لوگوں کو ان کی جانب متوجہ کرنا۔
- پیشہ ور لونڈیوں کو اسلام کی جانب مائل لوگوں کے پیچھے لگا دینا تاکہ وہ انہیں میوزک، شراب اور شباب میں گھیر نا۔[20]

مخالفت کرنے والوں میں ابو لہب، ابو جہل، نضر بن حارث، عاص بن وائل، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ نمایاں تھے۔ ان لوگوں نے کچھ ماہ بعد ایک قرارداد پاس کر کے جسمانی تشدد سمیت ہر حربہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جسمانی تشدد کا نشانہ بالعموم وہ صحابہ بنے جو یا تو کسی کٹر مشرک کے غلام تھے، یا پھر کسی عرب خاندان کے حلیف تھے اور اس کی کفالت میں رہ رہے تھے۔ حلیف وہ لوگ تھے جو اس قبیلے میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ کسی اور قبیلے کے تھے لیکن وہ کسی وجہ سے مکہ مکرمہ میں رہنا چاہتے تھے۔ اب کوئی بڑا سردار اسے اپنی کفالت کے لیے لے لیتا اور اسے مکہ مکرمہ میں رہنے کا موقع مل جاتا۔ اپنے حلیف اور غلام کی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ اس کا مالک جب چاہتا، اسے قتل یا تشدد کر لیتا۔

حضرت یاسر اور ان کی اہلیہ سمیہ رضی اللہ عنہما ابو جہل کے خاندان کے حلیف تھے، اس لیے ابو جہل نے انہیں اذیتیں دے کر شہید کر دیا۔ ان کے بیٹے عمار رضی اللہ عنہ پر تشدد کیا جانے لگا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ، امیہ بن خلف کے غلام تھے، وہ انہیں تپتی ریت پر لٹا

[20] مبارک پوری۔122-117

کر اذیتیں دینے لگا۔ یہی معاملہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا ہوا اور انہیں شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ تپتی ریت سے ہم تجربہ حاصل کر سکتے ہیں کہ ان کی کھال جھلس گئی تھی۔

بعض صحابہ جو طاقتور فیملی سے تعلق رکھتے تھے، وہ دوسروں کے ظلم و تشدد سے تو محفوظ رہے مگر ان کے اپنے بزرگوں نے ان پر تشدد کر کے انہیں اسلام قبول کرنے سے روکنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔[21] ان میں بنو امیہ کے حضرت عثمان، بنو اسد کے حضرت زبیر اور بنو ہاشم کے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم شامل تھے جن کے والدین اور چچاؤں نے ان پر تشدد کیا کہ انہیں دھوئیں میں پھنسا دیا لیکن انہوں نے تشدد قبول کر کے ایمان قائم رکھا۔[22]

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان مشرکین کے جسمانی تشدد سے تو محفوظ رہے مگر انہوں نے ذہنی اور نفسیاتی ٹارچر کی انتہا کر دی۔ دوسری فیملیوں کے لیڈرز تو طنز و مذاق کی حد تک رہا لیکن اپنی فیملی کے بڑے لوگوں نے ذہنی اذیت شروع کی۔ بالخصوص اس میں آپ کا سگا چچا ابو لہب پیش پیش تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو بیٹیوں رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما کا نکاح ابو لہب کے بیٹوں سے پہلے ہوا تھا لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ ابو لہب نے اپنے بیٹوں کو مجبور کر کے طلاق دلوا دی۔

جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعوت پیش کرتے، وہ ابو لہب وہیں جا کر لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے ہوئے پراپیگنڈا کرتا۔ اس کی بیوی ام جمیل بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف شدید بدزبانی کا مظاہرہ کرتی جیسے ہجو میں اشعار کہتی اور آپ کے گھر میں کانٹے پھینک دیتی۔ عقبہ بن ابی معیط، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوسی تھا، وہ آپ کے گھر کے باہر غلاظت پھینک دیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حرم شریف میں نماز پڑھ رہے تھے اور سجدہ کر رہے تھے تو ابو جہل نے آپ پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی۔ اسے دیکھا تو آپ کی بیٹی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسے ہٹایا۔[23]

اس ظلم و تشدد کے خلاف مسلمانوں نے کبھی ہاتھ نہ اٹھایا بلکہ یک طرفہ طور پر ظلم سہا جبکہ صرف ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جوابی وار کیا جس سے مشرک کا خون نکل آیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک بڑے بزنس مین تھے اور آپ کے پاس 40,000 درہم کا ڈیپوزٹ جمع تھا۔ انہوں نے اس دولت کو غلام خرید کر آزاد کرنے کے لیے وقف کرنا شروع کر دیا۔ غلام صحابہ بالخصوص بلال اور عمار رضی اللہ عنہما کو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قیمت ادا کر کے خریدا اور انہیں آزاد کر دیا۔

حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کا مکان کافی بڑا تھا اور شہر سے ہٹ کر تھا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت، اجتماعات اور تربیت کا علمی مرکز بنا لیا۔ حج کے موقع پر جب مختلف قبائل کے لوگ مکہ مکرمہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی

---

[21] منصور پوری۔1/83

[22] مبارک پوری۔128-134

[23] الازہری۔2/303-310

دعوت پیش کی۔ اسے عام طور پر قبول تو نہ کیا گیا لیکن پورے عرب میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ مکہ کے ایک محترم شخص نے نبوت کا دعوی کیا ہے اور تمام قبائل کے بڑے لوگ پہلے ہی آپ کے بزنس میں انوسٹ کر چکے تھے کیونکہ وہ آپ کو صادق و امین کہا کرتے تھے۔

دیگر قبائل میں ایک مشہور شخصیت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے جو قبیلہ بنی غفار کے رہنے والے تھے۔ وہ حنفاء میں سے تھے یعنی وہ توحید کو فطری طور پر مانتے تھے اور شرک پسند نہیں کرتے تھے۔ جب انہی کے ساتھیوں نے عمرہ کر کے اپنے قبیلے میں بتایا تو ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ بھی مکہ پہنچ گئے اور ایمان لائے۔ انہوں نے کھلے عام حرم شریف میں ایمان کا اعلان کیا تو لوگوں نے انہیں پکڑ کر مارنا شروع کیا۔[24] اسے دیکھ کر عباس رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انہوں نے تشدد سے روکا جبکہ لوگوں کو ڈرایا کہ اس طرح بنی غفار قبیلے سے جنگ ہو جائے گی اور تمہارا بزنس تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح مزید مثالیں مل سکتی ہیں جس میں دیگر قبائل کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ میں آ کر ایمان لاتے رہے۔

ہجرت حبشہ (614-616CE)

نبوت کے پانچویں سال یعنی 614CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو ہجرت کا مشورہ دیا تاکہ وہ تشدد سے بچیں۔ بالخصوص وہ کمزور صحابہ اپنی فیملی کے ساتھ حبشہ کی جانب ہجرت کرنے لگے تاکہ تشدد سے بچیں۔ معروف سیرت نگار ڈاکٹر حمید اللہ کا اندازہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی تعلقات حبشہ کے حکمران نجاشی سے تھے، جو تجارتی سفروں میں قائم ہوئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک بے تکلفانہ خط بھی نجاشی کو بھیجا۔[25] حضرت جعفر کے والد ابو طالب ان پر کوئی تشدد نہیں کرتے تھے، غالباً انہیں اسی وجہ سے بھیجا گیا تھا کہ وہ حبشہ میں مسلم کمیونٹی کو منظم کریں اور حکومت سے اچھے تعلقات قائم کر سکیں۔ ہجرت کا یہ عمل دو مرتبہ ہوا۔ حبشہ میں یہ غلط اطلاع پہنچی کہ مشرکین نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس پر بعض صحابہ واپس آئے تو یہاں کے حالات دیکھ کر انہیں 616CE میں دوبارہ ہجرت کرنا پڑی۔

شدید مشکلات کا دور (615-619CE)

کفار مکہ نے جناب ابو طالب پر دباؤ بڑھا دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں لیکن انہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ منکرین نے کمپرومائز کا فارمولا بھی آزمایا کہ آپ ایک سال ہمارے معبودوں کی پوجا کریں اور ایک سال

---

[24] صحیح بخاری۔ حدیث 3648۔

[25] محمد حمید اللہ۔ 187

ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تجویز ماننے سے سرے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے یہ آفر بھی دی کہ آپ کو ہم مکہ کا بادشاہ بنا دیتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول نہیں کیا۔

بعض لوگوں نے اب یہ منصوبہ بنایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا جائے۔ اس کے لیے بعض لوگوں نے انفرادی کوششیں کیں جو ناکام رہیں۔ اس مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کے دو نامور جنگجو پہلوان ایمان لائے: ایک رسول اللہ کے چچا حضرت حمزہ تھے اور دوسرے حضرت عمر رضی اللہ عنہما۔

سب سے دلچسپ واقعہ عمر رضی اللہ عنہا کے ایمان کا ہے کہ وہ اپنے لیڈرز کے پراپیگنڈا کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کے لیے تلوار لے کر نکلے۔ راستے میں انہیں بتایا گیا کہ ان کی بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید رضی اللہ عنہما تو ایمان لا چکے ہیں۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ پہلے ان کے گھر پہنچے اور اپنی بہن اور بہنوئی پر تشدد کرنے لگے۔ پھر انہیں زخم دیکھا تو دکھ بھی پیدا ہوا تو انہوں نے کہا کہ تم نے جتنا قرآن پڑھا ہے تو وہی سناؤ۔ اس پر قرآن مجید پڑھ کر سنایا تو عمر رضی اللہ عنہ متاثر ہوئے۔

اب یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ، اسی طرح تلوار لے کر ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں تلوار لے کر پہنچے۔ جتنے صحابہ وہاں موجود تھے تو وہ ڈر گئے لیکن حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہیں آنے دیں، اگر نیت خراب ہے تو میں انہی کی تلوار سے انہیں قتل کر دوں گا۔ لیکن اب ذہن تبدیل ہو چکا تھا اور انہوں نے کھلے عام ہی ایمان کا اعلان کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایمان کی بیعت کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں جنگجو حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما کی شمولیت سے مسلمان اتنے طاقت ور ہو گئے کہ وہ اب کھلے عام خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھنے لگے۔[26]

مکہ سے باہر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پھیل رہی تھی اور دیگر قبائل کے صالح لوگ ایمان لا رہے تھے جس کی مثال آپ بنو غفار کے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پڑھ چکے ہیں۔ دیگر قبائل کے بہت سے لوگ اپنے دل ہی دل میں ایمان لا چکے تھے مگر انہوں نے کئی سال تک اسے پوشیدہ رکھا۔ ایک مثال شخصیت مثنی بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ ان کا تعلق کویت کے قبیلے شیبان سے تھا۔ وہ حج کے لیے مکہ مکرمہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو پسند کیا لیکن ایمان کا اعلان نہیں کیا۔ اپنے ایمان کو وہ اپنے ذہن میں رکھا اور فتح مکہ کے بعد انہوں نے اعلان کیا۔ اس کے بعد انہوں نے عراق اور ایران کی فتوحات کر دیں۔ آہستہ آہستہ یہ دعوت عرب میں پھیلتی چلی گئی مگر ابھی اکا دکا لوگ ہی مسلمان ہوئے تھے۔

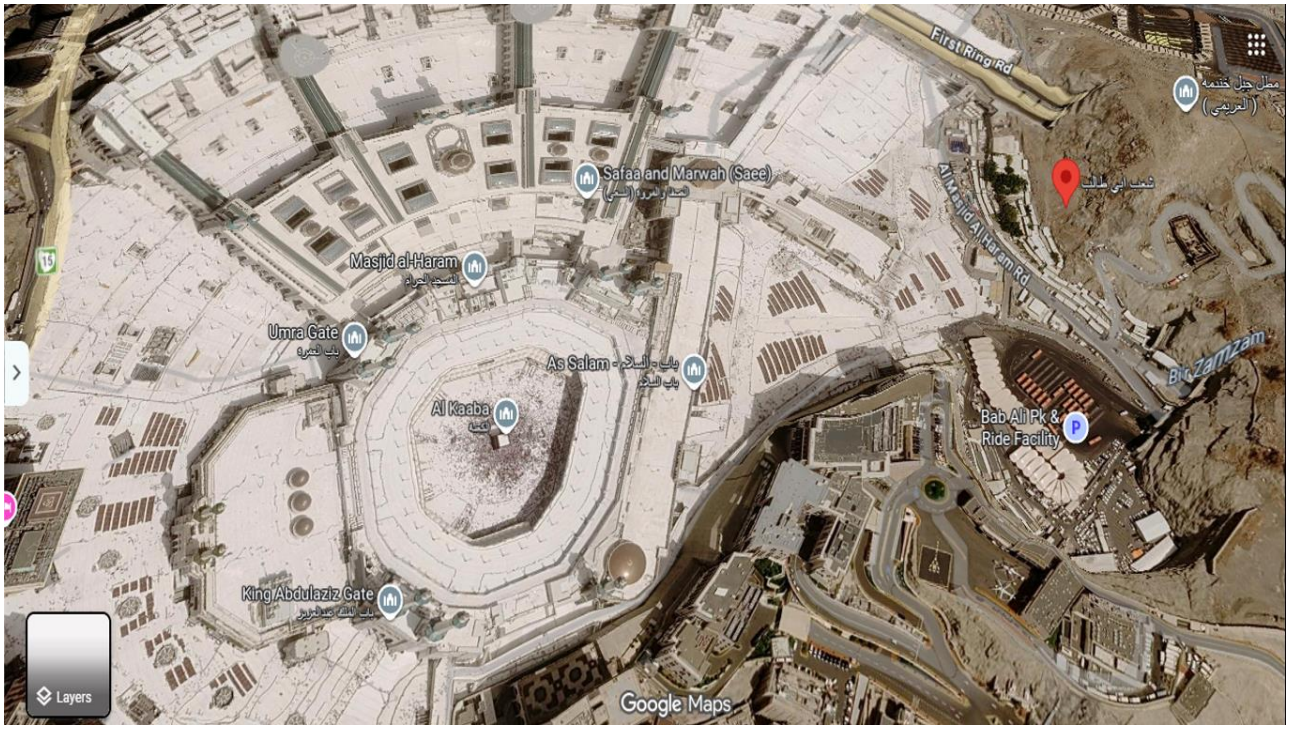
حبشہ (موجودہ ایری ٹیریا، سوڈان، ایتھوپیا اور ثومالیہ) میں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گئے، وہ بہتر حالات میں تھے اور انہوں نے وہاں دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھا اور اس میں انہیں بادشاہ نجاشی کی حمایت حاصل تھی۔ یہ نجاشی بادشاہ، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے حواری صحابہ رضی اللہ عنہم کے پیروکار تھے اور وہ کچھ عرصے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے۔ اس کے نتیجے میں

[26] بخاری، کتاب المناقب۔ حدیث 3650

اسلام کی دعوت افریقہ میں پھیلنے لگی۔

بائیکاٹ کا تشدد (616-619CE)

نبوت کے ساتویں سال یعنی 616CE میں مشرکین مکہ نے یہ معاہدہ کیا کہ بنو ہاشم کا مکمل طور پر بائیکاٹ کر دیا جائے تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت ترک کر دیں۔ اس وقت بنو ہاشم کے بہت سے لوگ ایمان نہیں لائے تھے لیکن وہ اپنی فیملی کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کرنے سے روکتے رہے تھے۔ اس معاہدے کے تحت بنو ہاشم سے کسی چیز کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی اور منکرین کی اکثر فیملی حضرات نے بائیکاٹ کر دیا۔ ابو لہب کے سوا بنو ہاشم کو مجبوراً ایک گھاٹی میں پناہ لینا پڑی جو کہ "شعب ابی طالب" کہلاتی ہے جو صفاء پہاڑی کے پیچھے ہے۔



تین سال تک یہاں بنو ہاشم رہے اور انہیں بسا اوقات درختوں کے پتے کھا کر گزارا کرنا پڑا لیکن یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے دستبردار نہ ہوئے۔ اس دوران بعض نیک دل مشرکین ان کی مدد کرتے رہے جن میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نمایاں تھے جو رات میں کھانا پہنچا دیتے تھے۔ انہوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ تین سال بعد 619CE میں بالآخر بعض مشرکین ہی کی تحریک پر یہ معاہدہ ختم ہوا اور بنو ہاشم کو اس سے نجات ملی۔ ان میں سے اکثر کو بعد میں اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔[27]

[27] سید سلیمان ندوی۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔59-57۔ ریاض: دار السلام۔(21 Jan 2010) www.kitabosunnat.com

عام الحزن اور طائف کا سفر (619CE)

نبوت کے دسویں سال یعنی 619CE کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشکلات کا کلائمیکس کہہ سکتے ہیں۔ اسے سیرت کے لٹریچر میں "عام الحزن" یعنی غم کا سال کہا گیا ہے۔ اس سال میں پہلا غم سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کی شکل میں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست حمایتی تھیں اور ان کی بیٹیاں زندہ تھیں۔ اگلا غم یہ ہوا کہ بنو ہاشم فیملی کے سردار جناب ابو طالب کا انتقال ہوا جو کہ اب تک ڈھال بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کرتے رہے تھے۔ ان کی جگہ ابو لہب بنو ہاشم کا سربراہ بن گیا جس نے آپ کی حمایت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔



اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مکہ مکرمہ میں رہنا ناممکن رہ گیا تھا، چنانچہ آپ نے اللہ تعالی کے حکم سے طائف کا سفر کیا اور راستے میں آباد قبائل کو اللہ تعالی کا پیغام پیش کرتے ہوئے طائف پہنچ گئے جو مکہ مکرمہ سے تقریباً 92 کلومیٹر ہے۔ یہاں کے سرداروں کے سامنے جب اللہ تعالی کا پیغام پیش کیا تو انہوں نے اہل مکہ سے بھی بڑھ کر بد تمیزی کی اور اپنے اوباش لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ آپ پر پہاڑی سے پتھر برسائیں۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے۔[1]

طائف میں عتبہ اور شیبہ بن ربیعہ نامی دو بھائی بھی تھے جو اہل مکہ میں سے تھے اور اسلام کے شدید مخالف تھے لیکن انہوں نے مکہ کی قبائلی عصبیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے باغ میں پناہ دی اور اپنے غلام عداس رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں انگور بھجوائے۔ عداس عیسائی تھے اور آپ نے ان کے سامنے جب دعوت پیش کی جو انہوں نے فوراً ایمان قبول کر لیا۔



مسجد عداس رضی اللہ عنہ، طائف

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا کی:

اللهم إليك أشكو ضعف قوتي، وقلة حيلتي، وهواني على الناس، أرحم الراحمين، أنت أرحم الراحمين، إلى من تكلني، إلى عدو يتجهمني، أو إلى قريب ملكته أمري، إن لم تكن غضبان علي فلا أبالي، غير أن عافيتك أوسع لي، أعوذ بنور وجهك الذي أشرقت له الظلمات، وصلح عليه أمر الدنيا والآخرة، أن تنزل بي غضبك، أو تحل علي سخطك، لك العتبى حتى ترضى، ولا حول ولا قوة إلا بك.

اے اللہ! میں اپنی قوت، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں۔ آپ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والے ہیں۔ درماندہ عاجزوں کے مالک بھی آپ ہی ہیں اور میرے مالک بھی آپ ہی ہیں۔ آپ نے مجھے کس کے سپرد کیا ہے، کیا بے گانہ ترش ذہن والوں سے یا اس دشمن کے، جو طاقتور ہے۔ لیکن جب مجھ پر آپ کا غضب نہیں ہے تو مجھے ان سب کی کوئی پروا نہیں کیونکہ آپ کی عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں آپ کی ذات کے نور میں پناہ کا طلب گار ہوں جس سے میری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دین و دنیا کے کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ (میں اسے بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ) آپ مجھ پر غضب ناک ہوں یا آپ کی ناراضی مجھ پر وارد ہو۔ میں تو آپ کی رضا کا طلب گار ہوں اور نیکی کرنے یا

برائی سے بچنے کی طاقت صرف آپ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔[28]

طائف کے کلائمیکس کے بعد حالات تیزی سے پلٹنا شروع ہوئے۔ اللہ تعالی کے حکم کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مکہ آئے تو ایک سردار مطعم بن عدی نے آپ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور آپ کی حفاظت فرمائی۔ پناہ کی ضرورت اس لیے تھی کہ بنو ہاشم کا سردار ابولہب دشمن تھا اور بنو ہاشم فیملی سے تعلق ختم ہو گیا تھا۔ واپسی کے راستے میں سورۃ الجن نازل ہوئی جس میں جنات کا ذکر ہے کہ جب انہوں نے قرآن مجید کی تلاوت سنی تو وہ جنات اہل ایمان تھے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اس دعوت کو سمجھا دیا۔

اعلان نبوت کے دسویں سال یعنی 619CE ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سفر معراج پیش آیا جو کہ آپ کی زبردست نفسیاتی تسکین کا باعث بنا۔ اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آنکھوں سے عالم بالا کو دیکھ لیا اور سابقہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام سے ملاقات ہوئی۔ اسی سال سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح ہوا جس سے سیدہ خدیجہ کی وفات کے نتیجے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا تھا، وہ پر ہو گیا اور بچیوں کی پرورش جاری رہی۔

مکی زندگی کا آخری دور (619-622CE)

دوسری طرف اہل عرب کا ذہن بھی تبدیل ہونے لگا۔ ظلم و ستم کے نتیجے میں اہل مکہ کی نوجوان نسل کے دل میں اسلام کی محبت داخل ہونے لگی اور وہ اسلام کی دعوت سے متاثر ہونے لگے۔ حج اور عمرہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوتی سرگرمیاں تیز کر دیں جس سے دیگر عرب قبائل میں اسلام پھیلنے لگا اور ان کے بعض بااثر افراد مسلمان ہونے لگے۔ مثلاً بنو دوس کے ایک سردار حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ بھی ایمان لائے اور انہوں نے اپنے قبیلے میں دعوت کا کام شروع کیا۔[29] یمن کے بعض لوگ بھی ایمان لائے۔ عمان کے قبیلہ ازد کے ایک سردار ضماد ازدی ایمان لائے۔ دیگر قبائل کے لوگوں نے آپ کی دعوت کو مثبت طور پر سنا اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

یہ دعوت سب سے زیادہ یثرب شہر میں پھیلی جہاں قبیلہ خزرج کے چھ سردار نے اسلام قبول کر لیا۔ یثرب میں دو قبیلے اوس اور خزرج رہتے تھے اور وہ ایک صدی سے آپس میں جنگیں کرتے رہے تھے۔ اب جدید جزیشن میں سعد بن عبادہ خزرج اور سعد بن معاذ اوس کے سردار تھے اور وہ دو سال بعد حج کے لیے آئے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے۔ ان دونوں میں شعور تھا کہ سو سال کی جنگ میں دونوں قبائل آپس میں جنگ کر تباہ ہو چکے ہیں اور یہ جنگ ختم ہونی چاہیے۔

انہوں نے اپنے شہر میں دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا جس سے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے اور اگلے سال 12 لوگ مکہ حاضر ہوئے اور

---

[28] منصور پوری۔1/94

[29] الازہری۔2/403-406

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی جسے "بیعت عقبہ اولی" کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا جنہوں نے ایک زبردست تبلیغی اور تعلیمی سرگرمی وہاں شروع کی۔ اس کے نتیجے میں اسلام یثرب کے گھر گھر میں داخل ہو گیا۔ 622CE میں 75 لوگ حج کے لیے مکہ آئے جن میں قبیلہ اوس اور خزرج دونوں کے سردار سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما شامل تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور آپ کو مدینہ آنے کی دعوت دی جسے اللہ تعالی کے حکم سے آپ نے قبول کر لیا اور مدینہ کو مسلم کمیونٹی کا مرکز بنانے کا فیصلہ فرمالیا۔[30] اس بیعت کو "بیعت عقبہ ثانیہ" کہا جاتا ہے۔

بیعت کا معنی ہے معاہدہ کر کے ہاتھ پکڑ کر آپس میں طے کر لینا۔ اس بیعت کا متن احادیث میں موجود ہے اور اسے پڑھ کر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کس طرح کیا جاتا تھا۔ اس متن میں یہ شرائط موجود ہیں:

بیعت عقبہ اولیٰ (621CE)

1. ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔
2. ہم چوری نہیں کریں گے۔
3. ہم زنا نہیں کریں گے۔
4. ہم اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔
5. ہم اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان کوئی بہتان گھڑ کر کسی پر تہمت نہیں لگائیں گے۔
6. ہم کسی معروف (نیک) کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی اسے پورا کرے گا، اس کا اجر اللہ پر ہے۔

بیعت عقبہ ثانیہ (622CE)

1. خوشی اور غمی (تنگی اور آسانی) دونوں حالتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سنی اور مانی جائے گی۔
2. حالات کیسے بھی ہوں، مالی قربانی دی جائے گی۔
3. نیکی کا حکم دیا جائے گا اور برائی سے روکا جائے گا۔
4. اللہ کے معاملے میں کسی معاملے میں بھی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کی جائے گی۔
5. جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں گے، تو مدینہ والے آپ کی ایسے ہی حفاظت کریں گے جیسے وہ اپنے

[30] ندوی۔ 61-62

جان ومال اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہیں۔(الرحیق المختوم، صفی الرحمان مبارکپوری)

دونوں سالوں کی بیعت میں اصل ایمان اور اخلاقیات کا معاہدہ ہے لیکن دوسرے سال میں یہ اضافہ ہوا کہ اہل یثرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا حکمران بنانے کا معاہدہ کر دیا۔ اس معاہدے میں دونوں قبیلے اوس اور خزرج کے سرداروں نے اس معاہدے پر سائن کر دیا۔

ہجرت نبوی(1H/622CE)

اہل مکہ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرگرمیوں کا علم تھا۔ وہ اب اس بات سے خائف تھے کہ اگر آپ نے ہجرت کر لی تو اسلام بہت تیزی سے ترقی کرے گا۔ اس وجہ سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو شہید کر لیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے مختلف قبائل کے جوانوں پر مبنی ایک تنظیم بنائی جس نے خفیہ طور پر رات کے اندھیرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کو شہید کرنا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آپ کا خاندان بنو ہاشم، ان تمام قبائل سے قصاص نہیں لے سکے گا جو جاہلیت میں بھی تمام قبائل کا آپس میں معاہدہ تھا۔

اللہ تعالی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کی اور آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ہجرت کر کے 415KM یثرب تشریف لے گئے جس سے اس مقدس شہر کا نام "مدینۃ النبی" یعنی نبی کا شہر ہو گیا اور آج تک اس کا یہی نام مدینہ المنورۃ سے مشہور ہے۔ اگرچہ کئی جنگجو قاتلانہ حملہ کرنے کو تیار تھے لیکن اللہ تعالی نے ان کی آنکھیں دھند میں بند کر دی اور وہ دیکھ نہیں سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دو دن تک غار ثور میں رہے اور پھر سفر کر کے مدینہ المنورۃ کی طرف چلے گئے۔

فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔

"اللہ ان (اپنے رسول کی) مدد اس وقت کر چکا ہے جب کفار نے انہیں نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو (ساتھیوں میں سے) ایک تھے۔ جب وہ دونوں غار میں تھے، اس وقت وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے، 'غم نہ کیجیے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔' اس وقت اللہ نے ان پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور ان کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو آپ کو نظر نہ آتے تھے۔ اس نے کفار کا پلان ناکام کر دیا جبکہ اللہ کا کلمہ بلند کر دیا کیونکہ اللہ بہت زبردست اور حکمت کا مالک ہے۔"(توبہ 9:40)

دلچسپ امر یہ تھا کہ مشرکین مکہ بلکہ دیگر قبائل کے لوگوں نے اس دشمنی کے باوجود اپنی قیمتی اشیا اور مال ودولت رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے پاس انوسٹمنٹ کے طور پر رکھا کرتے تھے کیونکہ زمانہ قبل از اعلان نبوت ہی سے آپ کی شہرت صادق اور امین کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے روانگی سے پہلے جو آخری کام کیا، وہ یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ نے یہ ذمہ داری سونپی کہ یہ امانتیں متعلقہ فلاں فلاں آدمی کے سپرد اتنا اتنا مال کر کے ہی مدینہ جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت سے پہلے اور بعد میں مکی صحابہ اور دیگر قبائل کے اہل ایمان ہجرت کرتے رہے اور اس طرح سے مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد قائم ہوئی۔ اسی سال سے ہجری کیلنڈر کا آغاز ہوا جو اس کتاب میں ہجری اور عیسوی کیلنڈرز ہر واقعے کے سامنے لکھے ہوئے ہیں۔

ہجرت کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جن لوگوں سے ملاقات ہوئی تو قرآن مجید کے ذریعے اللہ تعالی کا پیغام پہنچاتے رہے۔ اس میں یہ مشہور شخصیتیں سامنے آئیں۔ مکہ سے 85 کلو میٹر عسفان کے نزدیک کسی مقام پر ان کا سامنا سراقہ بن مالک سے ہوا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں تھے کیونکہ وہ قاتل لشکر کا حصہ رکھتے تھے۔ سراقہ انہیں پہچان گئے تھے لیکن آگے بڑھتے ہوئے ان کے گھوڑے کے قدم زمین میں دھنس گئے۔ اس معجزے کو دیکھ کر وہ ایمان لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے انہیں کسریٰ (ایرانی بادشاہ) کے کنگن پہننے کی بشارت دی جو پندرہ بیس سال بعد اس وقت پوری ہوئی جب خلیفہ دوم عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں کسریٰ کے محلات فتح ہوئے۔

بنو خزاعہ عرب کا ایک اہم قبیلہ تھا جو مکہ مکرمہ سے 160 کلو میٹر وادی قدید میں رہتے تھے۔ اس قبیلے کی خاتون ام معبد اپنی شعر و شاعری کی وجہ سے پورے عرب میں مشہور تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے سفر کے دوران جب ان کے خیمے کے پاس پہنچے تو ان کی ایک بکری وہاں موجود تھی۔ آپ نے اس کا دودھ دوہنے کی اجازت مانگی۔ یہ بکری دودھ دینے کے لائق نہ تھی، اس لیے ام معبد معذرت کرنے لگیں لیکن آپ کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے اس تھنوں میں کثیر مقدار میں دودھ اتار دیا۔ ام معبد اس معجزے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئیں اور انہوں نے بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ایک فی البدیہہ نظم کہی۔ بعد میں ام معبد، ان کے شوہر اور اکثر قبیلے کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

باب 3: مدینہ منورہ میں سیرت نبوی (1-11H/622-632CE)

ابتدائی چیلنجز اور اقدامات

مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متعدد نئے گروہوں سے واسطہ پڑا اور نئے چیلنجز سامنے آئے۔ اوس اور خزرج قبیلوں کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ کی حکومت کا حکمران قائم کر دیا تھا۔ اس لیے چیلنجز بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برداشت کرنے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ 622CE میں مدینہ منورہ کی آبادی میں کون گروپس موجود تھے اور ان کے چیلنجز کیا تھے؟

1. **مہاجرین:** یہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جو مکہ مکرمہ اور دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ ان کے کاروبار اور جائیدادیں مکہ میں رہ گئی تھیں اور ان پر مشرکین نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے انہیں سیٹل کرنا ایک بڑا معاشی چیلنج تھا۔
2. **انصار:** یہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن کا تعلق مدینہ منورہ سے تھا اور حمایت کے معاہدے کی وجہ سے وہ **"انصار"** یعنی **"مددگار"** کے نام سے مشہور ہوئے۔ پرانی تاریخ میں حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام کے مددگار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن مجید میں **"حواری"** کہا جاتا ہے تو یہی اسٹیٹس انصار حواریوں کو ٹائٹل بن گیا۔ یہ دو قبائل اوس اور خزرج تھے اور پھر ہر قبیلے میں متعدد خاندانوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔

   اوس اور خزرج میں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ایک بڑی جنگ **"بعاث"** ہو چکی تھی اور اس جنگ کی نفرتیں ابھی تازہ تھیں جبکہ 100 سال سے وہ آپس میں جنگیں کرتے رہے تھے۔ ان سب کو یکجا کرنا اور ان کی باہمی دشمنیوں کو ختم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک بہت بڑا سیاسی اور معاشرتی چیلنج تھا۔ انصار کے نو مسلموں کی تعلیم و تربیت بھی کرنے کا ایک بڑا اہم کام کرنا ہی تھا۔
3. **مدینہ کے مشرکین:** یہ لوگ اوس اور خزرج ہی کے تھے لیکن وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے اور تذبذب کا شکار تھے۔ ان تک دین کی دعوت پہنچانا اور پھر ان میں جو لوگ ایمان لائیں تو ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا ایک بڑا چیلنج تھا۔ مدینہ منورہ سے

باہر مختلف علاقوں میں قبائل رہتے تھے اور ان کی اکثریت مشرکین میں سے تھے۔ یہ لوگ بھی کسی وقت مدینہ منورہ پر حملہ کر سکتے تھے، تو حکومت کے لیے یہ چیلنج تھا کہ وہ اس شہر کی سکیورٹی کر سکیں۔

4. **منافقین:** یہ وہ لوگ تھے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے سبب بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر دل سے اسلام پر یا تو مطمئن نہیں تھے یا پھر کسی تعصب میں مبتلا تھے۔ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں منافقین کا کوئی وجود نہیں تھا کیونکہ کوئی بھی شخص ایسے نظریے کے لیے تکالیف نہیں اٹھاتا جس پر وہ ایمان نہ رکھتا ہو۔ ہجرت کے بعد چونکہ ایک حکومت قائم ہو گئی تھی، اس لیے دنیاوی مفادات کے تحت بعض لوگ منافق بن کر مسلم معاشرے میں داخل ہو گئے۔ ان لوگوں سے نمٹنا ایک اور بڑا چیلنج تھا۔

ان میں سب سے نمایاں شخصیت عبد اللہ بن ابی تھا جس کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے اہل مدینہ اس عبد اللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ بنانے کا ارادہ کر چکے تھے لیکن اب یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اس وجہ سے یہ دل ہی دل میں مسلمانوں کا شدید مخالف بن چکا تھا اور سارے منافقین نے عبد اللہ بن ابی کو اپنا سیاسی لیڈر قائم کر دیا۔

5. **مدینہ کے یہود:** مدینہ منورہ میں یہود کے تین قبائل آباد تھے جن کے نام بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ تھے۔ یہ مدینہ کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ تھے اور مدینہ کی معیشت اور تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ سودی کاروبار کے ذریعے انہوں نے اوس اور خزرج کے بہت سے لوگوں پر اپنا اثر ورسوخ قائم کر رکھا تھا۔ انہوں نے بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت کو قبول کر تو لیا اور ساتھ معاہدہ کر لیا کہ وہ امن کے ساتھ مدینہ میں رہیں گے۔

اس معاہدے کے مطابق ہر انسان کو مذہبی آزادی ہو گی اور کسی پر جبر نہیں ہو گا۔ مسلمان اور یہود آپس میں کوئی جنگ نہیں کریں گے بلکہ اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو سب اکٹھے مل کر سیکورٹی کریں گے۔ چیلنج اس طرح پیدا ہوا کہ اس معاہدے کی خلاف ورزی یہود قبائل نے کی اور انہیں جلاوطنی کرنی پڑھی۔

6. **مکہ کے مشرکین:** مکہ کے مشرکین کے لیے اسلام اب ایک بڑا خطرہ بن چکا تھا کیونکہ اسے ایک حکومت کی طاقت حاصل ہو چکی تھی۔ انہوں نے مدینہ منورہ کی اس ریاست کے خلاف گوریلا کاروائیاں شروع کر دیں۔ یہ سب سے بڑا خارجی چیلنج تھا۔ عرب کے تمام قبائل نے اہل مکہ قریش کو اپنا اوور آل استاذ مان لیا تھا کیونکہ وہ سب ہی حرم شریف کی عزت کرتے تھے۔

7. **مدینہ سے باہر کے مشرک قبائل:** مدینہ کے گرد ونواح میں متعدد عرب قبائل آباد تھے جن کا مذہب بت پرستی تھا۔ ان میں سے بعض اہل مکہ کے حمایتی تھے اور بعض غیر جانبدار تھے۔ ان کے ساتھ نمٹنا ایک بڑا چیلنج تھا۔ ان میں سے بعض قبائل لوٹ مار کے عادی تھے اور مدینہ کی ریاست کی صورت میں ایک معاشی قوت ان کے سامنے آ چکی تھی جس کی جانب یہ للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالی کی براہ راست رہنمائی میں ان چیلنجز سے نمٹنے کا سلسلہ شروع فرمایا۔[31] آپ نے مدینہ پہنچنے کے بعد مسجد نبوی تعمیر کروائی جو کہ نہ صرف مسجد تھی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مدینہ کی حکومت کا سیکرٹریٹ اسی مسجد نبوی میں قائم ہو گیا تھا۔ تعلیم و تربیت کے لیے اسے ایک تعلیمی ادارے کی حیثیت اس مسجد نبوی کو بھی ہو گئی تھی۔ اب تمام نو مسلم فیملی کو حکم دیا کہ وہ روزانہ مغرب کی نماز مسجد نبوی میں ادا کیا کریں۔ بہت سی آبادی مسجد نبوی کے قریب تھی لیکن کئی کلو میٹر کے بعد مختلف علاقوں میں محلے بنے ہوئے تھے۔ اب نو مسلم وہاں سے روزانہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید کا مطالعہ کرنے لگے۔

مہاجرین کو سیٹل کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مواخات کا اہتمام فرمایا۔ اس معاہدے کے تحت ہر مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بنا دیا۔ انصار نے اپنے ان بھائیوں کو سیٹل ہونے میں شاندار مدد کی لیکن مہاجرین نے بھی ان پر بوجھ بننا پسند نہ کیا بلکہ کاروبار اور زراعت میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس طرح وہ جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ انصار نے اس درجے ایثار کا مظاہرہ کیا کہ اپنی زرعی زمینوں اور کھجور کے باغات کو مہاجرین کو دینے کا ارادہ کیا لیکن مہاجرین نے اسے قبول نہ کیا۔ طے یہ پایا کہ مہاجرین، انصار کی زمینوں پر کام کریں گے اور پیداوار کو ان کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔[32]

اس کی خوبصورت مثال یہ حاضر ہے کہ سابقون الاولون صحابہ میں عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جب مدینہ منورہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعد بن الربیع انصاری رضی اللہ عنہ کو بھائی طے کر کے معاہدے کروا دیے۔ اب سعد بن الربیع انصاری رضی اللہ عنہ بہت امیر آدمی تھے چنانچہ انہوں نے اپنے مہاجر بھائی کو کہا کہ زمین، گھر آدھا لے لیجیے اور آپ کی شادی میں کرواتا ہوں۔ اس پر عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں بلکہ آپ صرف بازار ہی سمجھا دیجیے۔ ان کے پاس کافی انوسٹمنٹ موجود تھی اور انہوں نے بزنس شروع کیا اور انہوں نے بزنس شروع کیا تو اس میں بہت برکت ہو گئی اور ایک انصاری خاتون سے شادی ہو گئی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محبت سے انہیں فرمایا کہ آپ نے جلدی سے شادی کر دی ہے تو ولیمہ کر لیجیے خواہ ایک بکری ہی کا ہو۔[33]

مہاجرین، انصار، یہود اور مشرکین مدینہ کے ساتھ ایک معاہدہ تحریر کیا گیا جسے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے تاریخ انسانی کا پہلا تحریری دستور قرار دیا ہے۔[2] اس کی تفصیل ہم اگلے ابواب میں بیان کریں گے۔ اس معاہدے کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ کی ریاست کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ سبھی قبائل اور خاندانوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی دے دی گئی۔ یہود کو ایک الگ امت تسلیم کیا گیا اور انہیں اپنے مذہبی اور اندرونی معاملات میں خود مختاری دے دی گئی۔ کسی خطرے کی صورت

---

[31] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ بحوالہ خالد مسعود۔ حیات رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم۔ 82۔ لاہور: دار التذکیر۔

[32] بخاری۔ کتاب المزارعۃ۔ حدیث 2200

[33] صحیح بخاری: باب بنیان الکعبہ، باب کیف اخی النبی ﷺ بین الصحابہ

میں لازم تھا کہ مدینہ کے تمام باشندے، مذہب سے قطع نظر، مل کر مقابلہ کریں گے۔

اس حکومت میں ڈیکٹیٹر شپ کی بجائے قرآن مجید کے حکم "**وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ**" کے تحت حکومتی نظام تیار ہوا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اللہ تعالی نے یہ حکم سورۃ الشوریٰ میں نازل ہوا جبکہ یہ سورۃ الشوری ہجرت سے کچھ دن پہلے ہی نازل ہوئی تھی۔

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ. وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ. وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ.

(اہل ایمان وہ لوگ ہیں) جو بڑے گناہوں جیسے کھلی ہوئی بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور جب کبھی غصہ آجائے تو پھر ایسے انسان ہیں کہ درگذر بھی کر لیتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہی ہے: نماز کا اہتمام رکھا ہے جبکہ **ان کا نظام (Decision Making) اُن کے باہمی مشورے پر مبنی ہے۔** ہم نے جو رزق انہیں عطا فرمایا ہے تو اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ (صحابہ کرام) ایسے ہیں کہ جو بدلہ اس وقت ہی لیتے ہیں، جب اُن پر زیادتی کی جائے۔ (سورۃ الشوری 42:37-39)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ حکمران بن گئے تھے اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے انتہائی محبت کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ڈیکٹیٹر شپ اختیار نہیں کی بلکہ "**وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ**" کے تحت حکومتی فیصلہ کے لیے مسجد نبوی میں ہی مشورہ لیا جاتا اور پھر اکثریت کی بنیاد پر ہی فیصلے کو قبول کر لیا جاتا تھا۔ اب مسجد نبوی ہی میں پارلیمنٹ قائم ہوئی اور چونکہ ہر اہل ایمان سے مشورہ لیا جاتا تو سب کی ماٹیویشن ایسی شاندار ہو جاتی کہ ہر چیلنج کے لیے ساتھ ہوتے۔

مدینہ منورہ میں جو لوگ ابھی شرک پر قائم تھے، ان میں دعوت و تبلیغ کا زبردست سلسلہ شروع کیا گیا۔ یہ لوگ مسلمان انصار ہی کے قریب رشتے دار تھے، اس لیے ان میں دعوت پھیلنے لگی اور آہستہ آہستہ یہ سب مسلمان ہو گئے۔ یہودیوں کے ساتھ بھی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ چونکہ یہ ایک تعلیم یافتہ قوم تھی اور اس کے پاس تورات موجود تھی، اس لیے ان سے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے براہ راست گفتگو کی اور انہیں قرآن مجید ایسا سمجھایا کہ قرآن اور تورات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں ان کے سب سے بڑے عالم دین عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔[34] تاہم یہودیوں کی اکثریت نے آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا لیکن انہی کے اسکالر عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ دعوت پہنچاتے رہے۔

مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دو اہتمام کیے گئے: ایک قرآن مجید کی تعلیم کا اسکول اور دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیکچرز۔ سب مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ نماز کے لیے مسجد نبوی میں آئیں اور مختلف نمازوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں دین کی اخلاقیات اور شریعت کی وضاحت کرتے تھے۔ ہر نماز میں ہی کسی صحابی کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا تو وہ نماز کے

[34] بخاری۔ کتاب الانبیا۔ حدیث 3151

بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ لیتے اور انہیں مطمئن بھی کیا جاتا تھا۔ اگر کسی صحابی سے غلطی ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے دیکھ کر محبت سے سمجھا دیتے تاکہ اصلاح ہو جائے۔

مسجد نبوی کے ساتھ ایک پلیٹ فارم تعمیر کیا گیا جسے "صفہ" کہا جاتا ہے۔ اس پر ایک چھپر نما چھت تھی اور یہ ان صحابہ کے لیے تھا جو ہمہ وقت دین سیکھتے تھے اور دن میں محنت مزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کر لیتے تھے۔ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ابھی نئے ایمان لائے ہیں۔ ان کی اکثریت مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور اپنا علاقہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں آ کر مہاجر بن چکے تھے۔ انہیں بھی انصار نے مدد کی اور معاشی طور پر انہیں سیٹل کر دیا۔ کچھ سالوں میں مدینہ منورہ میں نئے گھروں کی کنسٹرکشن کا سلسلہ بھی ہوتا رہا اور مختلف محلوں کے درمیان خالی جگہوں پر بھی آبادی ہونے لگی۔

بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے گرد و نواح میں موجود قبائل کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے تاکہ وہ خطرہ نہ کریں۔ عربوں کی یہ خوبی تھی کہ وہ جب معاہدہ کر لیتے تو پھر دشمنی نہیں کرتے تھے۔ ان معاہدوں کی بنیادی شق یہ تھی کہ مدینہ کی ریاست اور یہ قبائل اپنے اپنے معاملات میں آزاد ہوں گے اور کسی ایک فریق پر بیرونی حملے کی صورت میں دوسرا فریق اس کا ساتھ دے گا۔ ان میں سب سے نمایاں قبیلہ جہینہ تھا جو مدینہ کے شمال میں آباد تھا۔ ایسا ہی معاہدہ بنو ضمرہ کے ساتھ کیا گیا جو ساحلی تجارتی شاہراہ کے ساتھ آباد تھا۔ اس طرح سے شمالی سمت بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ ہو گئی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان قبائل کے دروازے اسلام کی دعوت کے لیے کھل گئے۔

اہل مکہ سے اعلان جنگ (1H/622-623CE)

دوسری جانب اہل مکہ نے مدینہ کی ریاست کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ انہوں نے حرم مکہ کے دروازے مسلمانوں کے لیے بند کر دیے حالانکہ عرب روایت کے مطابق وہ کسی کو خانہ کعبہ میں آ کر عبادت کرنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ پہلے تو انصار رضی اللہ عنہم عمرہ اور حج کے لیے مکہ مکرمہ آتے رہتے تھے لیکن اب قریش نے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں چھوٹی موٹی گوریلا کاروائیاں شروع کر دیں۔ یہ لوگ مدینہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کے جانور لوٹ لیتے۔ اب تک مسلمانوں نے مشرکین مکہ کے خلاف کوئی جنگی کاروائی نہ کی تھی مگر اس موقع پر اللہ تعالی نے انہیں اس کی اجازت دے دی۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ. الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ.

ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے، جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور یقیناً اللہ ان کی

مدد کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال باہر کیا گیا ہے اور یہ محض اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ بعض لوگوں کے (جہاد کے) ذریعے بعض (ظالموں) کی سرکوبی نہ کرتا تو خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور مساجد، جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے، مسمار کر دی جاتیں۔ اللہ ان لوگوں کی مدد ضرور کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ یقیناً اللہ بہت طاقتور اور زبردست ہے۔ (الحج 22:39-40)

ابھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں اہل ایمان پر ظلم بھی کیا جاتا تھا لیکن انہیں جنگی جہاد کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل ایمان کی تعداد زیادہ نہیں تھی اور اگر وہ جنگ شروع کرتے تو مشرکین تمام اہل ایمان کو شہید کر دیتے۔ لیکن اب مدینہ منورہ میں حکومت قائم ہو گئی تو پھر اللہ تعالی نے جنگی جہاد کی اجازت دے دی اور اس کا طریقہ کار سورۃ الانفال میں واضح کر دیا جس کا مطالعہ ہم آگے جا کر کریں گے۔

اس اجازت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ اور ان کے حلیف دشمنوں کے خلاف کاروائیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان میں سب سے نمایاں اسٹریٹیجک کاروائی یہ تھی کہ اہل مکہ کے شام اور فلسفطین کے ساتھ تجارتی راستے کو بند کر دیا جائے۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ دور جاہلیت ہی سے شام اور یمن کے ساتھ تجارت ہی اہل مکہ کی خوشحالی کا سبب تھی۔ اگر اس تجارت کو بند کر دیا جاتا تو اہل مکہ مجبور ہو کر مسلمانوں کی مخالفت سے باز آ جاتے۔ شام سے تجارت بند ہو جاتی تو یمن کی تجارت خود بخود ختم ہو جاتی کیونکہ وہ یمن کا مال، فلسطین میں اور فلسطین کا مال یمن میں فروخت کیا کرتے تھے۔

اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہمات روانہ کرنا شروع کیں جن کا مقصد اہل مکہ کے تجارتی قافلوں کو روکنا تھا۔ سن 1-2/623-624 میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عسکری مہمات اس تجارتی شاہراہ پر بھیجنا شروع کر دیں جن کے کئی مقاصد تھے: ایک تو یہ کہ اہل مکہ کے تجارتی راستے پر کنٹرول حاصل کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ لوٹ مار کرنے والے قبائل پر مدینہ کی ریاست کی ہیبت طاری ہو جائے اور وہ اس پر حملہ کرنے کی کوئی جرأت نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ جو قبائل دوستی پر آمادہ ہوں، ان کے ساتھ دوستانہ معاہدے کیے جائیں اور وہ مدینہ منورہ پر حملہ نہ کریں۔

اس طرح ان مہمات کو ہم کثیر المقاصد (Multi-purpose) مہمات کہہ سکتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصے میں ایسی آٹھ مہمات روانہ کی گئیں جن میں سے تین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تشریف لے گئے۔ ان میں کوئی جنگ نہیں ہوئی اور متعدد قبائل کے ساتھ صلح کے معاہدے ہوئے اور بڑی حد تک ساحلی شاہراہ پر مسلمانوں کو کنٹرول حاصل ہو گیا۔

جنگ بدر اور اس کے بعد کا زمانہ (2-3/624-625)

اہل مکہ نے اب مدینہ منورہ پر فیصلہ کن ضرب لگانے کا فیصلہ کیا اور 1000 افراد پر مشتمل ایک لشکر تیار کر کے بھیجا۔ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ

ان کا ایک بڑا تجارتی قافلہ شام اور فلسطین سے آ رہا تھا اور مسلمانوں نے اسے روکنے کا فیصلہ کیا اور اپنا لشکر بدر کے مقام پر روانہ کیا جس کی تعداد صرف 313 فوجی تھے۔ اہل مکہ نے اس کی حفاظت اور مسلمانوں کے استیصال کے لیے اپنا لشکر تیار کر کے بڑے جوش و جذبے سے بھیجا۔ قافلہ تو بچ کر نکل گیا مگر بدر کے مقام پر دونوں افواج کا آمنا سامنا ہوا۔

جنگ بدر کے لیے تربیت کا طریقہ کار

اس لشکر کی تیاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین ہی کو شامل کیا کیونکہ انصار سے معاہدہ یہ تھا کہ مدینہ پر حملہ ہوا تو وہ مدد کریں گے لیکن باہر کے لیے ان پر ذمہ داری نہیں تھی۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لشکر کو تیار کیا تو نتیجہ کیا نکلا جسے ہم انصار اور مہاجرین رضی اللہ عنہم کے الفاظ میں دیکھ سکتے ہیں۔

مقداد بن عمرو مہاجر رضی اللہ عنہ کا قول: ”یارسول اللہ! جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے، اسی طرح چلیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں جس طرف بھی آپ جائیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہ کہنے والے ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں ہم کہتے ہیں کہ چلیے آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں اور ہم آپ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہو۔“

مدینہ کا قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ جو عمرہ کے لیے مکہ آئے تھے تو مکہ کے لیڈر ابو جہل نے کہا: ”سعد بن معاذ! تم تو ہمارے دین کے مرتدوں کو پناہ دے رہے ہو اور ان کی امداد اور اعانت کا دم بھر رہے ہو تو ہم تمہیں اطمینان سے مکہ میں طواف کرنے دیں؟ اگر امیہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو زندہ یہاں سے نہیں جا سکتے تھے۔“ (1H/623CE)

سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ کا قول: ”ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ اے اللہ کے رسول! جو کچھ آپ نے ارادہ فرما لیا ہے، اسے کر گزریے۔ قسم ہے کہ اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اگر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ دیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جنگ کریں تو ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلہ میں سچی جان نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں کہ اللہ تعالی آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھوا دے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں۔“ (2H/624CE)

سعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ کا انصار کو مشورہ: ”ٹھیرو اہل یثرب! ہم لوگ جو ان (رسول اور مہاجرین کے ساتھ) آئے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور آج انہیں یہاں سے نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمہارے ننہال قتل ہو جائیں گے اوور تلواریں تم پر برسیں گی۔ لہذا اگر اس کی برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ موجود ہے۔ اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف معذرت کر دو کیونکہ اس وقت عذر کر دینا خدا کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔“ (621CE) (تفہیم القرآن)

نقشے میں اہل مکہ کے تجارتی راستے کو نیلے رنگ کی مدد سے دکھایا گیا ہے جبکہ اہل مدینہ کی اسٹریٹیجی کو سبز رنگ میں دکھایا گیا ہے۔ اب اہل مکہ کا لشکر سرخ رنگ کے ذریعے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے آیا۔

ابو جہل اہل مکہ کے لشکر کا کمانڈر ان چیف تھا اور اس نے چیلنج کیا کہ اس جنگ میں جسے فتح ہوئی تو اس کا دین درست ہو گا۔ اسے یقین کا تھا کہ وہ آسانی سے 1000 لشکر سے فتح حاصل کر لے گا کیونکہ اہل ایمان کا لشکر صرف 313 افراد پر مبنی تھا۔ زبردست جنگ ہوئی جس میں اللہ تعالی نے مسلمانوں کو تین گنا بڑے دشمن پر فتح نصیب کی۔ 70 کے قریب کفار مارے گئے، 70 گرفتار ہوئے اور ان کا بقیہ لشکر فرار ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے صرف 14 آدمی شہید ہوئے۔ مارے جانے والوں میں اہل مکہ کی پوری لیڈر شپ شامل تھی جن میں ابو جہل، امیہ بن خلف، عتبہ اور شیبہ بن ربیعہ نمایاں تھے۔



جنگ بدر (2H/624CE) https://mubashirnazir.org/2022/11/25/%d9%82%d8%b1%d8%a2%d9%86-%d8%a7%d9%88%d8%b1-%d8%a8%d8%a7%d8%a6%d8%a8%d9%84-%da%a9%db%92-%d8%af%db%8c%d8%b3-%d9%85%db%8c%da%ba-2/



سب سے بڑا دشمن ابولہب جنگ میں شریک نہ تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کے بھتیجے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ ابولہب نے اپنی جگہ رقم دے کر غلاموں کو اس لشکر میں شامل کر دیا تھا تاکہ وہ بچ جائے لیکن اللہ تعالی نے سزا یہ دی کہ وہ چیچک کے حملے کا شکار ہوا اور اس میں مارا گیا۔ ابوجہل کے اس چیلنج میں اللہ تعالی نے اسے قبول کر لیا تھا تاکہ اس فتح سے عام آدمی مان لے کہ کونسا دین درست ہے اور کونسا دین غلط ہے؟

اس جنگ میں ایسا بھی ہوا کہ باپ بیٹے کے اور بھائی بھائی کے مد مقابل تھا۔ بقیہ لوگ بھی قریبی رشتے دار تھے کیونکہ مشرکین بھی قریش قبیلے کے تھے جبکہ مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قریش ہی کے لوگ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے لوگوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا جو زبردستی جنگ میں لائے گئے تھے اور مکی دور میں انہوں نے مسلمانوں کو تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ ان میں بالخصوص ابوالبختری اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ شامل تھے جنہوں نے ابھی اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا مگر مسلمانوں کے لیے جاسوسی کی خدمات انجام دیتے تھے۔ ابوالبختری ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے قریش کے بائیکاٹ کو ختم کروانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

قرآن مجید نے اس جنگ کو **یوم الفرقان (فیصلہ کن دن)** قرار دیا کیونکہ اس میں حق و باطل کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس جنگ کا اللہ تعالی نے فرعون کے غرق کیے جانے سے موازنہ کیا۔ اس کی تفصیل کا مطالعہ سورۃ الانفال میں کیا جا سکتا ہے جس کا موضوع ہی جنگ بدر اور اس سے متعلق حالات ہیں۔ اس کے لیے ہم صرف ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ. (26) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ

تَعْلَمُونَ. (27) وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ. (28) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ. (29) وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ. (30)

اس وقت کو یاد کر لیجیے کہ جب آپ بہت کم تھے جبکہ زمین میں آپ کو کمزور سمجھا جاتا تھا۔ آپ ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ آپ کو اچک نہ لیں۔ پھر اللہ تعالی نے آپ کو پناہ (مدینہ منورہ میں) دے دی اور اپنی نصرت سے آپ کی تائید کر لی اور آپ کو رزق کے لیے پاکیزہ اشیاء عطا فرمائیں تاکہ آپ شکر گزار رہ سکیں۔ اہل ایمان! اللہ و رسول سے بے وفائی نہ کیجیے گا کیونکہ (یہ امانت میں خیانت ہے) اور جانتے بوجھتے اپنی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب نہ کیجیے گا۔ جان لیجیے کہ آپ کا فائنانشل فنڈ اور آپ کی اولاد ایک آزمائش ہیں اور یہ بھی کہ اجر عظیم اللہ تعالی ہی کے پاس ہے۔

اہل ایمان! اگر آپ اللہ تعالی سے خبر دار رہے تو وہ آپ کے لیے **فیصلہ کن واضح ثبوت** نمایاں کر دے گا، آپ کے گناہ آپ سے ڈیلیٹ کر دے گا اور آپ کو مغفرت فرما دے گا کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی بڑے فضل کا مالک ہے۔ اس وقت کو یاد رکھیے (اے رسول!) جب منکرین آپ کے معاملے میں سازش کر رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا (ملک سے) نکال دیں۔ وہ یہ سازش کر رہے تھے اور اللہ تعالی بھی اپنا پلان کر رہا تھا کیونکہ اللہ تعالی بہترین پلان فرمانے والا ہے۔ (سورۃ الانفال 8)

مشرکین کی سازشیں رہی تھیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ مکرمہ ہی میں قتل کر دیں لیکن ناکام ہوئے۔ اس کے بعد مدینہ منورہ پر گوریلا سازش کی لیکن ناکام رہیں۔ بالآخر مشرکین نے سب سے بڑا لشکر بھیجا تاکہ بدر میں تمام اہل ایمان جو 313 تھے تو انہیں ہم آسانی سے قتل کر لیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ مشرکین کے تمام بڑے 70 لیڈرز قتل ہو گئے اور 70 فوجی گرفتار ہوئے جبکہ باقی 860 فوجی بھاگ نکلے۔

جہاد کرتے ہوئے اخلاقیات کے احکامات

اس پہلی جنگ سے چند دن پہلے اللہ تعالی نے جنگ کا اصول سمجھا دیا کہ جنگ کے دوران بھی اخلاقیات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اسے ہم اسی سورۃ الانفال میں پڑھتے ہیں۔ جاہلیت کی جنگوں میں تو اخلاقیات کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن اللہ تعالی نے اہل ایمان کو اخلاقیات کی پابندی پہلے ہی سمجھا دی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے ہی پریکٹیکل کر کے ہی دکھا دیا اور تربیت کر دی۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ. (46) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ. (47)

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ۖ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ. (48)

اللہ تعالی اور اُس کے رسول کی اطاعت کیجیے اور آپس میں نہ جھگڑیے گا کہ اِس کے نتیجے میں ہمت ہار جائیں گے اور آپ کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ ثابت قدم رہیے، اِس لیے کہ اللہ تعالی اُن کے ساتھ ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہو سکیں۔ آپ اُن (منکر) لوگوں کی طرح نہ بن جایئے گا جو اپنے گھروں سے تکبر کے ساتھ لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے تھے اور ان کا رویہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی راہ سے روکتے ہیں جبکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں تو اللہ تعالی اسے کنٹرول کیے ہوئے ہے۔

یاد کیجیے جب شیطان نے اُن کے اعمال انہیں خوش نما بنا کر دکھائے تھے اور کہا کہ آج لوگوں میں کوئی نہیں جو تم پر غلبہ پا سکے اور (مطمئن رہو) کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے چلتا بنا اور کہنے لگا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو، میں اللہ تعالی سے ڈرتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی سخت سزا دینے والا ہے۔ (سورۃ الانفال 8)

الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ. (56) فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ. (57) وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ. (58) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ. (59) وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ. (60)

(اے رسول!) خاص کر (دیگر قبیلوں کے) وہ لوگ جن سے آپ نے معاہدہ کیا تھا، پھر ہر مرتبہ وہ اپنا معاہدہ توڑ دیتے ہیں اور ذرا سا نہیں ڈرتے (کہ اِس کا نتیجہ کیا ہو گا۔) چنانچہ انہیں لڑائی میں پائیں تو اِن کو ایسی مار ماریں کہ جو ان کے پیچھے ہیں، انہیں بھی تتر بتر کر دیجیے تاکہ وہ سبق حاصل کر سکیں۔ (آپ لوگ البتہ ہر حال میں معاہدہ کی پابندی کیجیے) اور اگر کسی قوم سے بد عہدی کا اندیشہ ہو تو ان سے معاہدہ اسی طرح برابری کے ساتھ اُن کے آگے (کینسل کر کے) پھینک دیجیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ منکرین اِس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ نکل بھاگے ہیں، یہ ہرگز ہمارے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے۔ (اہل ایمان!) آپ لوگوں سے جس قدر ہو سکے، اِن کے لیے فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھیے جس سے اللہ تعالی اور آپ کے اِن دشمنوں پر آپ کی ہیبت رہے۔ اِن کے علاوہ دوسروں کو بھی (ہیبت دے دیجیے) جنہیں آپ نہیں جانتے ہیں مگر اللہ تعالی انہیں جانتا ہے۔ (اِس مقصد کے لیے) جو کچھ آپ اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کریں گے، وہ آپ کو پورا دے دیا جائے گا اور آپ کے لیے کوئی کمی نہ ہو گی۔ (سورۃ الانفال 8)

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. (61) وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ ۚ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ. (62) وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. (63) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ

الْمُؤْمِنِينَ. (64)

یہ لوگ اگر صلح کی طرف جھکیں، (اے رسول!) تو آپ بھی اِس کے لیے جھک جایئے اور اللہ تعالی پر بھروسا رکھیے۔ بے شک اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ اگر وہ آپ کو دھوکا بھی دینا چاہیں گے تو مطمئن رہیے کہ اللہ تعالی آپ کے لیے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی مدد اور اہل ایمان کے ذریعے سے آپ کی تائید کی ہے۔ اس طرح کہ اہل ایمان (قریش، اوس اور خزرج قبیلوں) کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے ہیں۔ اگر آپ زمین میں جو کچھ ہے، سب خرچ کر ڈالتے، تب بھی اُن کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، مگر اللہ تعالی نے انہیں متحد کر دیا ہے۔ یقیناً اللہ تعالی زبردست بڑی حکمت والا ہے۔ اے نبی! آپ کے لیے اللہ تعالی کافی ہے اور یہی مومنین کافی ہیں جنہوں نے آپ کی پیروی اختیار کرلی ہے۔ (سورۃ الانفال 8)

جاہلیت میں جنگ کا طریقہ کار یہ تھا کہ لشکر کے راستے میں جو بھی گاؤں ملتا تو اسے تباہ کر دیا جاتا اور لڑکوں، لڑکیوں کو گرفتار کر کے اپنی لونڈی بنا دیا جاتا تھا اور انہیں ریپ کیا جاتا۔ جنگ کا مقصد یہ ہوتا کہ دشمن سے جو مال مل جاتا تو اس سے چھین لیا جاتا۔ دشمن کی لاش کو بری طرح کاٹ کر ہڈیاں توڑ دی جاتیں تاکہ شکار جانوروں کو کھانا مل جائے۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ارشادات فرمایئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اسلامی لشکروں کو جہاد پر روانہ کرتے تو انہیں واضح طور پر یہ ہدایات فرمایا کرتے تھے: "اللہ کے نام سے اور اللہ کی راہ میں غزوہ کیجیے اور اللہ کا انکار کرنے والوں سے جنگ کیجیے۔ غزوہ کریں لیکن معاہدے کے خلاف کوئی عمل نہیں کرنا ہے۔ (غنیمت میں) خیانت نہ کیجیے اور مقتولین کے اعضا نہ کاٹیں اور کسی بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل ہرگز نہ کیجیے۔" (صحیح ابی داؤد 2613)

عبداللہ بن یزید انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ مار اور مثلہ (لاش کی بے حرمتی) کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (صحیح البخاری 2474) مردہ کی ہڈی توڑنا، زندہ شخص کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے۔ (ابن ماجہ 1320)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آپ رخصت ہونے کی اجازت کے لیے حاضر ہوئے، اس وقت آپ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو پہلے ہدایت کی تھی کہ فلاں فلاں قریشی اگر ملیں تو انہیں آگ میں جلا دینا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آگ کی سزا دینا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے اجازت نہیں ہے۔ اس لیے اگر وہ ملیں تو انہیں قتل کر دیجیے گا لیکن آگ میں نہیں جلانا ہے۔ (صحیح البخاری، 2954)

مغیرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ولوگ مر گئے تو انہیں برا نہ کہیے کیونکہ جو کچھ عمل انہوں نے آگے بھیجا تھا، اس کے پاس وہ خود پہنچ چکے ہیں۔" (صحیح بخاری 1393)

سہل بن معاذ اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا تو لوگوں نے (زائد از ضرورت جگہیں گھیر کر) منزلوں کو تنگ کر دیا اور راستے بند کر دیے تھے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منادی کرنے والے کو بھیجا کہ وہ لوگوں میں اعلان کر دے کہ "جس نے جگہ تنگ کر دیا یا راستہ بند کیا تو اس کا کوئی جہاد نہیں ہے۔" اسنادہ

حسن، رواہ ابوداؤد۔[مشکوۃ المصابیح/کتاب الجھاد/حدیث:3920]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآہ وسلم سے روایت کی، کہ آپ نے فرمایا:"راستوں میں بیٹھنے سے بچیے۔" لوگوں نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے لیے اپنی مجلسوں میں بیٹھے بغیر چارہ نہیں کیونکہ ہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"اگر آپ بیٹھے بغیر نہیں رہ سکتے تو راستے کا حق ادا کیجیے۔"لوگوں نے پوچھا: راستے کا حق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:"نگاہیں جھکا کر رکھنا (چلنے والوں کے لیے) تکلیف کا سبب بننے والی چیزوں کو ہٹانا، سلام کا جواب دینا، اچھی بات کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔"[صحیح مسلم/کتاب اللباس والزینۃ/حدیث:5563]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مجبوری میں بھی ایسی صورت اختیار کرنی چاہیے جس سے گزرنے والوں کی آمد ورفت میں خلل نہ ہو اور انھیں تکلیف بھی نہ پہنچے۔ افسوس کہ مسلمان ہی سیاست کے طور پر دھرنا کرتے ہیں اور اسے جہاد کہتے ہیں حالانکہ ان احادیث سے ہم خود سوچ سکتے ہیں کہ ہمارا جہاد ہے یا فساد فی الارض۔

جنگ بدر کا نتیجہ (2-3H/624-625CE)

جنگ بدر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل مکہ میں انتقام کی آگ بہت تیز ہو گئی لیکن معقول لڑکوں کو محسوس ہوا کہ ابوجہل نے جو چیلنج کیا تھا کہ جسے فتح حاصل ہوئی تو پھر اس کا دین درست ہے۔ دوسری طرف وہ عرب قبائل جو لوٹ مار کرتے تھے، وہ بھی مدینہ منورہ کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے گوریلا حملے ختم کر دیے۔ تیسری جانب یہودیوں کو بھی مسلمانوں کی طاقت سے شدید خطرہ لاحق ہوا اور چوتھی طرف منافقین بھی مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے۔ اب یہ چاروں گروپس آپس میں رابطے کرنے لگے تاکہ ایک بڑی طاقت جمع کر کے مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کو ختم کیا جاسکے ورنہ ان کی طاقت بہت زیادہ ہوتی جائے گی۔

انفرادی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی کئی کوششیں کی گئیں جو کہ اللہ تعالی کی حمایت سے ناکام رہیں۔ مثلاً یہودیوں کا قبیلہ بنو قینقاع اس مخالفت میں سب سے زیادہ سرگرم تھا۔ انہوں نے منافقین کی مدد سے اوس اور خزرج میں دوبارہ جنگ کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناکام بنادیا کہ اوس وخزرج کی آپس میں محبت ہونے لگی۔

بعض دہشت گرد حضرات نے مسلم خواتین پر مجرمانہ حملے شروع کر دیے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اب مجرمین کو سخت سزا دی کہ انہیں سنگسار کر دیا گیا اور بنو قینقاع کو جلہ وطن کر دیا۔ منافقین کے سربراہ عبداللہ بن ابی نے نہایت عاجزی کے ساتھ ان کی جاں بخشی کی اپیل کی جسے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منظور کر لیا لیکن اس قبیلے کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا۔

لوٹ مار کرنے والے قبائل بنو سُلَیم، بنو ثعلبہ اور بنو محارب نے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی جانب دو مہمات روانہ کیں اور یہ منتشر ہو گئے اور بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ قریش مکہ کے لیے

اب ساحلی شاہراہ بند ہو چکی تھی۔ انہوں نے عراق کے طویل راستے پر سفر شروع کیے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک مہم بھیجی جو کہ کامیاب رہی اور اس قافلے کا تمام مال و اسباب مسلمانوں کے حصے میں آیا۔

جاہلیت میں اصول یہ تھا کہ جس فوجی کو جو مال مل گیا، وہ اس کا ہو گیا لیکن اللہ تعالی کے احکامات کے مطابق مال غنیمت کو روک کر اس پر حکم نازل ہوا۔ عربی میں مال غنیمت کو "انفال" کہا جاتا ہے اور اسی پر اس سورۃ کا نام الانفال ہو گیا۔ جاہلیت میں فوجیوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ مال غنیمت ہی سے ان کی ماٹیویشن آتی تھی اور وہ لشکروں میں شامل ہو کر جنگ کیا کرتے تھے اور راستے میں ہر گاؤں سے جانور اور سبزی چھین لیتے تھے۔ اللہ تعالی نے اس کا حکم فرما دیا:

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.(41)

(اہل ایمان! آپ نے پوچھا ہی تھا تو) سن لیجیے کہ جو کچھ مال غنیمت آپ نے حاصل کیا تھا، اُس کا پانچواں حصہ (20%) اللہ تعالی، اُس کے رسول، (رسول کی) فیملی، یتیم، مسکین اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔ (یہ اللہ تعالی کا حکم ہے، اس کی بے چون و چرا تعمیل کر دیجیے) اگر آپ اللہ تعالی پر ایمان رکھتے ہیں اور اس (قرآن) پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن (یوم الفرقان) نازل کی تھی۔ جس دن دونوں گروہوں میں جنگ ہوئی تھی، اور (جان رکھیے کہ) اللہ تعالی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (سورۃ الانفال)

جاہلیت کا اصول یہ تھا کہ قیدیوں کو اپنا غلام بنا لیتے۔ اس میں مردوں سے زبردستی مزدوری کی جاتی جبکہ لشکر میں خواتین بھی ہوتیں تو انہیں لونڈی بنا کر زبردستی ان سے ریپ کیا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ قرآن مجید کے اصول کے مطابق عمل کیا۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ ذَٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ.(4)

(اہل ایمان!) تو جب ان منکرین سے آپ کے جنگ (بدر اور رسول کے زمانے کی دیگر جنگوں) کی نوبت آ جائے تو بے دریغ گردنیں مار دیجیے گا۔ یہاں تک کہ جب آپ انہیں اچھی طرح کچل دیں، تب قیدی بنا کر مضبوط باندھ لیجیے گا۔ پھر جب قیدی بنا لیں تو اس کے بعد احسان کر کے یا پھر فدیہ لے کر چھوڑ دینا ہے یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار چھوڑ دے۔ یہ کام ہے جو آپ نے کرنا ہے۔ اگر اللہ تعالی چاہتا تو انہیں خود ہی انتقام لے لیتا، لیکن اس رب نے آپ کو حکم دیا کہ آپ میں سے ایک کو دوسرے سے آزمائش کر لے۔ (آپ مطمئن رہیے کہ) جو لوگ اللہ تعالی کی راہ میں شہید ہوئے، ان کے اعمال اللہ تعالی ہرگز ضائع نہیں ہونے دے گا۔ (سورۃ محمد (47

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ

لَكُمْ ۖ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ. (70) وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ.(71)

اے نبی! آپ کے قبضے میں جو قیدی ہیں، اُن سے کہہ دیجیے کہ اللہ آپ کے دلوں میں کوئی خیر دیکھے گا تو جو کچھ آپ سے لیا گیا ہے، اُس سے بہتر آپ کو عطا فرما دے گا اور آپ کے گناہ معاف کر دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی بخشنے والا ہے اور اس کی شفقت ہمیشہ کے لیے ہے۔ اگر یہ آپ کے ساتھ بد عہدی کرنا چاہتے ہیں تو اِن سے بعید نہیں ہے، اِس لیے کہ اِس سے پہلے انہوں نے خدا سے بد عہدی کی ہے۔ پھر اسی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالی نے آپ کو ان پر قابو دے دیا اور اللہ تعالی سب کچھ جانتا ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ (سورۃ الانفال 8)

جب اللہ تعالی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منورہ میں حکومت دے دی تو اس وقت عرب منکرین نے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی پلاننگ کی۔ شروع میں انہوں نے رات میں حملہ کر کے ڈکیتی شروع کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سیکورٹی کر دی۔ پھر اہل مکہ نے پہلی بار حملہ جنگ بدر میں کیا تھا۔ اس میں منکرین کا لشکر 1000 فوجیوں کا تھا جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر صرف 313 تھے۔ اللہ تعالی نے آزمائش کی کہ یہ اہل ایمان کیا اس کاوش میں تیار ہوں گے۔ چنانچہ یہ کامیاب ہوئے اور 70 منکرین قتل ہوئے اور 70 قیدی بنے۔ باقی 860 فوجی سب وہاں سے بھاگ نکلے۔

اس زمانے میں جاہلیت کا اصول یہ تھا کہ قیدیوں کو غلام بنانا تھا لیکن اللہ تعالی نے اس غلامی کو ختم کر دیا کہ آئندہ مزید کوئی غلام نہیں بنایا جائے گا۔ سورۃ محمد کے مطابق ان قیدیوں سے یا تو فدیہ لینا تھا یا پھر احسان کر کے انہیں مفت میں چھوڑ دیا تھا اور ان سے معاہدہ کرنا تھا کہ آئندہ ہم سے جنگ نہیں کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن قیدیوں کے پاس مال تھا، ان سے مال لیا اور انہیں آزاد کر دیا۔ سب سے دلچسپ قیدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے ابھی ایمان کا اعلان نہیں کیا تھا بلکہ وہ جاسوس کے طور پر خدمت کر رہے تھے۔ اس لیے ان سے مال لیا اور پھر انہیں واپس دے دیا۔ مکہ مکرمہ میں انہوں نے اپنی اولاد اور معقول نوجوانوں تک قرآن مجید کی دعوت پہنچاتے رہے لیکن ایمان کا اعلان فتح مکہ (8H/630CE) کے موقع پر کیا تھا۔

جو تعلیم یافتہ قیدی تھے، انہیں فدیہ یہ لیا کہ وہ انصار بچوں کی تعلیم کریں تاکہ وہ پڑھ سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل مکہ تجارتی سفر میں تحریر پڑھنا لکھنا سیکھ چکے تھے جبکہ انصار کی تعلیم بچپن میں نہیں ہوئی تھی۔ کچھ بہت غریب قیدی تھے تو انہیں احسان کے طور پر کسی فدیہ کے بغیر ہی آزاد کر دیا گیا۔

جنگ احد اور اس کے بعد کا زمانہ(3-5H/625-627CE)

جنگ احد کا پلان اور جنگ کی حکمت عملی(3H/625CE)

اہل مکہ اب مدینہ پر بڑے حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کیونکہ جنگ بدر میں اپنی شکست میں آگ لگ رہی تھی۔ اہل مدینہ کے منافقین بھی اہل قریش میں آگ لگانے کی کوشش کر رہے تھے اور معاہدہ کر لیا کہ فتح ہوئی تو منافقین کو مدینہ کی حکومت مل جائے گی۔ بالآخر انہوں نے شوال 3H/625CE میں 3000 کے لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اس لشکر کے سربراہ حضرت ابوسفیان تھے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے۔ اس سے پہلے مکہ مکرمہ میں ابوسفیان نے کبھی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ وہ معقول انسان تھے۔

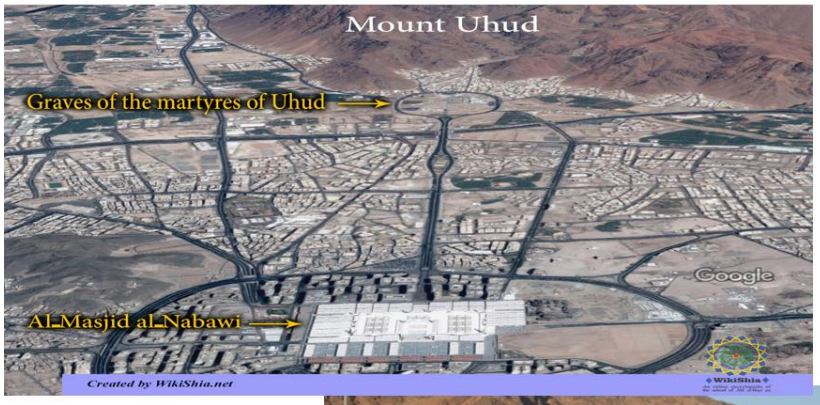
اس لشکر کی اطلاع حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ بھیجی جنہوں نے ابھی اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ مسلم لشکر نے مدینہ سے باہر نکل کر مقابلے کا پلان بنایا۔ ایک سال پہلے جنگ بدر میں مخلص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد 313 تھی لیکن اب تیزی سے لوگ ایمان لا رہے تھے اور اب مخلص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد 700 جنگجو ہو گئے تھے جبکہ ان کی فیملی کے لحاظ سے اہل ایمان کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔

جنگ احد کی پلاننگ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "**وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ**" کا اصول استعمال کیا۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ ہم شہر کے اندر سے ہی سیکورٹی کر لیں لیکن نئے اہل ایمان کی رائے یہ تھی کہ ہم کھلے میدان میں جنگ کریں۔ ان کی ڈیمانڈ اس لیے تھی کہ وہ جنگ بدر میں شامل نہیں ہو سکے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ کھلے عام جہاد کر سکیں۔ ان کی تعداد کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مل جل کر فیصلہ کرنے والے اصول کے تحت اکثریت کی رائے کو قبول کیا اور کھلے عام احد پہاڑ کے پاس جا کر لشکر لے گئے۔ اس وقت مدینہ کے لشکر کی تعداد 1000 تھی مگر عین موقع پر عبداللہ بن ابی اپنے 300 ساتھی منافقین لے کر بھاگ گئے۔

احد کے میدان میں جنگ ہوئی۔ شروع میں مسلم لشکر غالب آیا اور اہل مکہ کی صفیں بے ترتیب ہو گئیں اور وہ فرار ہونے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیر اندازوں کا ایک دستہ مقرر کر رکھا تھا جس کا کام ہی ایسی کسی کاوش کو ناکام بنانا تھا۔ جب لشکر کفار بھاگنے لگا اور مسلمان مال غنیمت لوٹنے لگے تو یہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور سوائے چند ایک کے انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ان نئے اہل ایمان سے غلطی ہوئی تھی تو اللہ تعالی نے تمام اہل ایمان کو تنگی کا تجربہ کروا دیا۔



احد پہاڑ مسجد نبوی سے 5 کلو میٹر

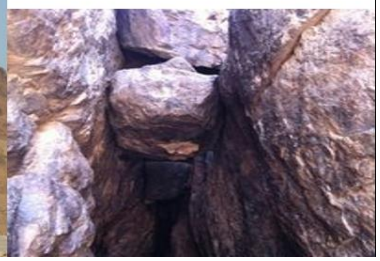




فتح کے بعد مشرکین کا دوسرا تیز حملہ ہوا تو احد پہاڑ کی یہ غار ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صابقون الاولون ابو بکر، عمر، ابو عبیدہ، طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم موجود رہے۔ مشرکین بہت سے تیر مارتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو دانت شہید ہوئے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے ہاتھ پر تیر روکتے رہے جبکہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دانتوں کو نکالنے کے لیے اپنے دانت شہید کر چکے۔

یہ پہاڑی ہے جس میں لشکر سکیورٹی کے طور پر پیچھے سے حملہ کرنے والوں کو روکنے کے لیے موجود تھے لیکن یہ اہل ایمان غلطی سے پہاڑی سے نیچے اتر آئے۔





جنگ احد میں اہل ایمان کی شدید مشکلات اور اس کا حل

اس موقع پر خالد بن ولید، ابھی ایمان نہ لائے تھے اور لشکر کفار کے شہسواروں کے قائد تھے۔ انہوں نے ایک لمبا چکر کاٹ کر مسلم لشکر کی پشت پر آ گئے۔ خالد بن ولید کو موقع مل گیا اور انہوں نے پشت کی جانب سے اہل ایمان پر حملہ کیا۔ یہ دیکھ کر فرار ہونے والے لوگ بھی پلٹے اور انہوں نے سامنے سے حملہ کر دیا۔ دونوں جانب سے مسلمان نرغے میں آ گئے تو ان کی صفیں بے ترتیب ہو گئیں اور ہر شخص انفرادی جنگ کرنے لگا۔ ستر کے قریب صحابہ کرام شہید ہوئے جن میں حضرت حمزہ، انس بن نضر اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔

مشرکین کے رشتے دار پہلے جنگ بدر میں قتل ہوئے تھے تو وہ بدلہ لینے کے شوق میں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ نے جنگ بدر میں ون ٹو ون جنگ کے دوران ہند بنت عتبہ خاتون کے بھائیوں کو قتل کیا تھا۔ اس وقت لشکر میں خواتین بھی

ہوتی تھیں۔ اس جنگ ابوسفیان کی اہلیہ ہند بن عتبہ شامل تھیں اور وہ حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے بدلہ کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ایک غلام وحشی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیں تو پھر وحشی کو آزاد کر دیا جائے گا۔ اس میں وحشی تیر کے ماہر تھے اور وہ کامیاب ہوئے۔

ابوسفیان، ہند اور وحشی رضی اللہ عنہم کئی سال بعد فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے۔ وحشی رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے کہ "اگر میں نے خیر الناس (بہترین انسان) سیدنا امیر حمزہ کو شہید کیا تھا، تو بدلے میں مسیلمہ کذاب (بدترین فراڈ کرنے والا جعلی نبی) کو بھی قتل کر دیا ہے تا کہ اس برے کام کا ازالہ ہو سکے۔" (صحیح بخاری 4072)

مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کے لیے زبردست حملہ کیا اور اس میں آپ زخمی بھی ہوئے تاہم آپ کے قریبی صحابہ جن میں حضرت ابو بکر، عمر، علی، سعد، طلحہ، ابوعبیدہ، زبیر اور بعض انصار رضی اللہ عنہم شامل تھے نے اس حملے کو ناکام بنا دیا تاہم حضور زخمی ہوئے۔ مشرکین نے یہ مشہور کیا کہ آپ شہید ہو گئے ہیں۔ اس پر مسلم افواج میں بے نظمی پیدا ہو گئی مگر آہستہ آہستہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اکٹھا کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دانت شہید ہوئے تھے تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے نکالنے کی کوشش تو ان کے دانت بھی شہید ہو گئے تھے۔

اہل ایمان کی شدید مشکلات کے باوجود منکرین کا فرار اور غزوۃ حمراء الاسد

اہل مکہ بھی اب تھک چکے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے لشکر کو لے کر واپسی کی راہ اختیار کی۔ مسلم فوج نے اپنے زخمیوں کی دیکھ بھال کی اور مقتولین کو دفن کیا۔ زخموں کے باوجود اگلے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ لشکر کو لے کر لشکر قریش کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ لشکر حمراء الاسد نامی مقام تک گیا۔ اس وقت نئے اہل ایمان کے مورال میں کمزوری آئی تھی تو اللہ تعالی نے سورۃ آل عمران میں منافقین کے پروپیگنڈا کو صحیح کر دیا اور نئے اہل ایمان کا مورال صحیح ہو گیا۔ اہل مکہ کا لشکر اس رعب میں آ گیا اور انہوں نے واپسی ہی کو مناسب سمجھا۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ.(151)وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ.(152)إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ.(153)

اب ہم ان منکرین کے ذہن میں آپ پر رعب بٹھا دیں گے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالی کے ساتھ (اوتار انسانوں کو) شریک ایجاد کر بیٹھے جس کا کوئی ثبوت نازل نہیں فرمایا۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے کیونکہ اپنی شخصیت پر ظلم ڈھانے والوں کے لیے یہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ اللہ تعالی نے (اپنی

مدد کا) جو وعدہ آپ سے کیا تھا، وہ تو اسی وقت پورا کر دیا تھا جب آپ اللہ تعالی کی وجہ سے انہیں قتل کر رہے تھے۔

یہاں تک کہ خود آپ (کے چند لوگوں نے) ہی کمزوری دکھائی تھی اور (رسول کے) حکم کی تعمیل میں ایک دوسرے سے اختلاف کر کے نافرمانی کی تھی۔ اللہ تعالی نے آپ کو وہ فتح دکھا دی جس کے آپ آرزو رکھتے تھے کیونکہ آپ میں کچھ دنیا کا فائدہ لینا چاہتے تھے جبکہ اکثر آخرت کی فتح چاہتے تھے۔

اللہ تعالی نے (اس فتح کے بعد) پھر آپ کا رخ تبدیل کر دیا تا کہ آپ کی آزمائش کرے تا کہ پھر بھی آپ کو معاف ہی کر دیا کیونکہ اللہ تعالی اہل ایمان پر بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔ یاد کیجیے جب آپ بھاگے جا رہے تھے اور کسی کو مڑ کر دیکھ بھی نہیں رہے تھے جبکہ رسول اللہ آپ ہی لوگوں کے گروپ کو پکار رہے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے آپ کو غم پر غم پہنچایا تا کہ (اس امتحان سے گزرنے کے بعد آئندہ) کسی نقصان اور کسی مصیبت کے آنے پر آپ کا مورال نہ گرے۔ جو کچھ آپ کر رہے ہیں تو اللہ تعالی اس سے جانتا ہے۔ (سورۃ آل عمران 3)



اس سال 3H/625CE جنگ احد میں کچھ گھنٹوں کے لیے مشرکین نے 70 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شہید کیا تھا لیکن اللہ تعالی نے ان پر ایسا رعب ڈالا کہ وہ مدینہ منورہ شہر کو فتح کرنے کی بجائے مسجد نبوی سے 14 کلو میٹر دور رک گئے جسے حمراء الاسد کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالی کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سابقون الاولون صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس جگہ تشریف لائے اور مشرکین پر چیلنج کر دیا جو غزوہ حمراء الاسد مشہور ہے۔

جنگ احد کے بعد منافقین کا جعلی پراپیگنڈا (4-5/626-627)

جنگ احد کے بعد مسلم دشمن قوتوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے مدینہ پر حملے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ بنو اسد، عضل، غطفان اور قارہ نامی قبیلوں نے مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائل کے لیے مہمات روانہ کیں جس کے نتیجے میں یہ تیاری سے پہلے ہی منتشر ہو گئے۔ اس زمانے میں دو افسوس ناک سانحے ہوئے۔ دو مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کے لیے بعض قبائل کی فرمائش پر مبلغین روانہ کیے جنہیں دھوکے سے شہید کر دیا گیا۔

جنگ احد میں مسلمانوں کا اگرچہ کچھ نقصان ہوا، مگر یہ جنگ ان کی تحریک کو دبا نہ سکی۔ منافقین کو البتہ موقع مل گیا کہ انہوں نے اپنے جعلی پراپیگنڈا کے ذریعے مورال کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اس میں اللہ تعالی نے سورۃ النور 24 اور سورۃ الاحزاب 33 میں اس پراپیگنڈا کا خاتمہ کر دیا۔ جعلی پراپیگنڈا کی خوفناک سازش یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی فیملی امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے بارے میں جعلی کہانیاں ایجاد کیں۔

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی فیملی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ دوسرے قبیلے بنو مصطلق کے لیے تشریف لائے تاکہ انہیں اللہ تعالی کا پیغام پہنچا دیں اور ساتھ ہی دشمنی ختم ہو جائے۔ اس قافلے میں منافقین بھی شامل تھے۔ رات میں قافلہ رک جاتا اور سب لوگ سو جاتے تھے اور صبح اگلا سفر شروع ہوتا۔ اونٹ کے اوپر کیبن ہوتے تھے جس میں خواتین اور مرد بھی سفر کے دوران اور رات میں سو جاتے تھے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اس میں تھیں اور آپ باہر گئی تھیں جبکہ لوگ سمجھے کہ اس کیبن میں آپ موجود ہیں اور قافلہ چل پڑا۔ قافلے کے پیچھے ایک صحابی پر ذمہ داری تھی کہ وہ چیک کرتے جائیں کہ کوئی چیز گر تو نہیں گئی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تو رہ گئی ہیں اور وہ انہیں دوسرے اونٹ میں بٹھا کر قافلے میں لے آئے۔ اس پر منافقین کو موقع ملا کہ انہوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف جعلی کہانی ایجاد کی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت دکھ ہوا تو اللہ تعالی نے یہ سورۃ النور نازل فرمائی۔ اس میں اہل ایمان کو سمجھایا کہ جب کوئی الزام بولے تو اسے ایک دم مان نہیں لینا چاہیے بلکہ پہلے ریسرچ کرنی چاہیے۔ جب یہ کنفرم ہو گیا تو پھر اس منافق لیڈر عبد اللہ بن ابی کو 80 کوڑے مارے گئے اور ساتھ ہی عدالتی گواہی کو ہمیشہ کے لیے بلیک لسٹ کر دیا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف جعلی کہانی گھڑی تو اللہ تعالی نے اس کا جواب سورۃ النور میں کر دیا اور اس کے نتیجے میں عبد اللہ بن ابی اور دیگر ساتھیوں کو 80 کوڑے کی سزا دی گئی۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ. (4)

جو لوگ پاک دامن خواتین پر (بدکاری کی) تہمت لگائیں، پھر (ثبوت کے طور پر) 4 گواہ نہ لا سکیں تو پھر ان (تہمت لگانے والوں) کو 80

کوڑے ماریں اور ان کی گواہی پھر کبھی قبول نہ کریں، اور یہی لوگ فاسق ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِنْكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَكُمْ ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ. (11) لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُبِينٌ. (12) لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ.(13)

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ یہ بہتان ایجاد کر بیٹھے ہیں، وہ آپ ہی کے اندر (شہر میں) ایک گروپ ہے۔ آپ اسے اپنے حق میں (اس سزا کو) برا نہ سمجھیے بلکہ یہ آپ کے لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا ہے، وہ اس کے حساب میں پڑے گا اور (اس پراپیگنڈا کا بانی) جس نے اس کا سب سے بڑا حصہ لیا ہے، اُس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔ آپ لوگوں نے جب یہ بات سنی تو اہل ایمان مردوں اور خواتین نے اپنے لوگوں کے حق میں نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ ایک کھلا ہوا بہتان ہے؟ یہ (الزام لگانے والے) اپنے الزام کے ثبوت میں 4 گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب گواہ نہیں لائے تو اللہ تعالی کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔ (سورۃ النور 24)

یہود کا قبیلہ بنو نضیر بھی کھلی دشمنی پر آمادہ ہو گیا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ 4H/625CE میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر یہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوئے اور انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ اب یہود کا صرف ایک قبیلہ بنو قریظہ کے لوگ مدینہ میں باقی رہ گئے تھے۔

غزوہ احد سے واپسی پر ابوسفیان مسلمانوں کو چیلنج کر گئے تھے کہ اگلے سال میدان بدر میں دوبارہ مقابلہ ہو گا۔ چنانچہ 4H/626CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر لے کر بدر گئے مگر اہل مکہ مقابلے پر نہ آئے۔ مسلمانوں نے اس سفر میں تجارتی فوائد حاصل کیے۔ 5H/626CE میں ایک مہم شمالی عرب کے شہر دومۃ الجندل کی طرف روانہ کی گئی جہاں کے قبائل مدینہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان مہمات سے جنگ احد کے اسٹریٹیجک نقصان کی تلافی ہو گئی اور عرب قبائل پر مدینہ کی ریاست کا رعب ایک بار پھر بیٹھ گیا۔

اس پورے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب قبائل میں دعوتی سرگرمیاں جاری رکھیں جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ ایمان لائے۔ ان مسلمانوں کے لیے لازم قرار دے دیا گیا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ جائیں۔ اس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست مضبوط ہوتی چلی گئی۔ اب دیگر قبائل کے مہاجرین جب مدینہ منورہ پہنچے تو ان کی تربیت کا سلسلہ جاری رہا جبکہ انصار ان کی معاشی مدد کرتے رہے۔

جنگ خندق اور اس کے بعد کا زمانہ(5-6H/627-628CE)

عرب قبائل کے سب سے بڑے لشکر کا مدینہ منورہ پر حملہ (5H/627CE)

دوسری طرف کفار مکہ اور بنو نضیر کے جلاوطن یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست تحریک شروع کی اور لوٹ مار کرنے والے عرب قبائل کو ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ انہوں نے 10,000 کا لشکر تیار کر کے 5H/627CE میں مدینہ کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ عربوں کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا لشکر تھا ورنہ سینکڑوں فوجی ہی کسی جنگ میں آتے تھے۔

مسلمانوں کے پاس اس وقت 3000 کے قریب جنگجو موجود تھے جو جنگ احد کے بعد مزید ایمان لائے تھے۔ جنگ احد کی پلاننگ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "**وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ**" کا اصول استعمال کیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تجویز پر خندق کھود کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ ایرانی طریقہ جنگ تھا جس سے عرب ناواقف تھے۔ یہ معاشی تنگی کا زمانہ تھا اور صحابہ کرام کی بڑی تعداد بھوکے پیٹ خندق کھود رہی تھی۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شام، ایران اور یمن کے مسلم حکومت میں شامل ہونے کی پیش گوئی فرمائی۔





جنگ احزاب میں وہ باؤنڈری ہے جس میں ہر طرف سے خندق بن گئی۔ تاریخی اعتبار سے یہ 7 مسجدیں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام پر ہیں جس میں انہوں نے اس خندق میں زیادہ سکیورٹی کی تھی۔ مشرکین کے سب سے بڑے پہلوان عمرو بن عبد ود اپنے ساتھیوں کے ساتھ خندق کو کراس کر کے مدینہ منورہ میں آیا اور اسے عرب میں 1000 فوجیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اسے روکنے کے لیے علی رضی اللہ عنہ سامنے آئے تو عمرو بن عبد ود ہنسا کہ تم تو میرے دوست کے بچے ہو، تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا ہوں لیکن علی رضی اللہ عنہ نے مقابلہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔
اس جنگ میں مشہور شہید سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہوئے کہ انہیں تیر لگا اور وہ زخمی ہو گئے۔ وہ اوس قبیلہ کے سردار تھے اور ان کی دوستی یہود قبیلہ بنو قرئضہ سے کئی سالوں میں تھی۔ اب بنو قرئضہ نے مشرکین سے طے کر لیا کہ تم خندق میں آ کر حملہ کرو اور ہم لوگ اندر سے ہی حملہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالی نے ٹھنڈی آندھی سے مشرکین کو بھگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو قرئضہ کے قلعے کو پکڑ لیا۔ یہودیوں نے درخواست کی کہ اگر آپ سعد بن معاذ کو جج بنا دیں تو ہم قلعہ کھول دیتے ہیں۔ آپ نے مان لیا اور پھر زخمی کے باوجود سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انہوں نے تورات کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا کہ بنو قرئضہ کے تمام جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے اور باقی سب کو قیدی بنایا جائے۔ کئی سالوں بعد اکثر قیدی ایمان لائے اور کئی لڑکوں نے احادیث نبوی اگلی جنریشنز تک پہنچائیں جو آج تک محدثین کی کتابوں میں ہیں۔

دن رات محنت کے بعد مدینہ کے شمالی اور مغربی جانب خندق تیار ہو گئی۔ بقیہ راستوں سے حملے کا خدشہ نہیں تھا کہ اس طرح پہاڑ تھے اور اس میں تیروں کے ذریعے دشمن کو روکا جا سکتا تھا۔ کفار کے لشکر نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا مگر مدینہ پر براہ راست حملہ نہ کر سکے کیونکہ پہاڑیوں اور خندق کے ساتھ ہی سیکورٹی کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رکے ہوئے تھے۔

عرب کے مشہور بہادر عمرو بن عبد ود نے خندق پار کر لی تو اس جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سیکورٹی کر رہے تھے۔ عمرو بن عبد ود نے پتلے سے لڑکے کو دیکھا تو ہنسا اور بولا کہ تم تو میرے دوست ابو طالب کے بیٹے ہو، اس لیے تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر علی رضی اللہ عنہ نے ون ٹو ون جنگ کی دنیا کے سب سے بڑے جنگجو عمرو بن عبد ود کو قتل کیا۔ باقاعدہ جنگ نہیں ہو سکی اور محاصرہ جاری رہا۔

بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کی کاوشوں سے بنو قریظہ کے یہودی کفار کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے اور صلح کے معاہدے کے باوجود انہوں نے مسلمانوں پر پیچھے سے حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس وقت یہودی قبیلہ بنو قریظہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور ابھی تک اس معاہدے پر عمل کر رہے تھے کہ وہ مدینہ پر حملہ ہوا تو وہ اہل ایمان کے ساتھ مدد کریں گے۔ لیکن اب بنو قریظہ خندق کے اندر شہر ہی میں حملہ کرنے کو تیاری کرنے لگے۔ جب ریکی کے لیے کچھ یہودی آئے تو دیکھا کہ شہر کے اندر تو صرف خواتین ہی موجود ہیں۔

انہوں نے پلان کیا کہ پہلے خواتین پر حملہ کریں تو دلچسپ واقعہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا نے ان یہودیوں کو قتل کیا اور اس کی گردن پکڑ کر یہودیوں کے قلعے میں پھینک دی۔ اس میں وہ لوگ ڈرنے لگے کہ خواتین پر حملہ بھی مشکل کام ہے۔

عربوں کے بڑے لشکر کیوں فرار ہوئے؟

اس موقع پر اللہ تعالی کی مدد آئی اور بنو غطفان کے ایک سردار نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے۔ انہوں نے اہل مکہ اور بنو قریظہ میں غلط فہمیاں پیدا کر دیں کہ وہ آپس میں اتحاد نہ کر سکے۔ اللہ تعالی نے ایک تیز آندھی بھیجی اور موسم نہایت ہی سرد ہو گیا۔ دوسری طرف حج کا موسم بھی قریب آ گیا اور اہل مکہ کو حج کے موقعے کے معاشی فوائد کی یاد ستانے لگی۔ بالآخر ان کے اعصاب جواب دے گئے اور انہوں نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ دلچسپ یہ واقعات ہوا کہ کمانڈر ان چیف ابو سفیان اپنے اونٹ پر واپسی کا اعلان کر کے چلے تو تھوڑی دور میں یاد آیا کہ اونٹ کی رسی نکالی ہی نہیں۔ انہوں نے تلوار سے رسی کاٹی اور اپنے لشکر کو لے کر تیزی سے نکل گئے۔

اس غزوہ میں کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی لیکن اہل مکہ نفسیاتی طور پر اس درجے میں ٹوٹ پھوٹ گئے کہ اس کے بعد کبھی دوبارہ مدینہ منورہ پر حملہ آور نہیں ہو سکے۔

جنگ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس قبیلے کی جانب سے یہ دوسری مرتبہ بدعہدی تھی۔ اس سے پہلے یہ جنگ بدر کے موقع پر اہل مکہ کی مالی مدد کر کے معاہدے کو توڑ چکے تھے۔ انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈالے کہ ان کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کریں گے۔ یہ قبیلہ اوس کے سردار اور جلیل القدر صحابی تھے اور دور جاہلیت میں بنو قریظہ ان کے قبیلے کے حریف یعنی دوست تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شرط کو قبول کر لیا۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے تورات کے قانون کے مطابق فیصلہ یہ کیا کہ ان کے جنگجو مردوں کو قتل کر دیا جائے جبکہ خواتین اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے۔ اس فیصلے پر عمل ہوا اور بنو قریظہ کو ان کی بدعہدی کی سزا مل گئی۔ خواتین اور بچے قیدی بد کر کچھ عرصے

بعد مسلمان ہو گئے اور انہیں کچھ عرصے بعد آزاد کر دیا گیا۔ احادیث میں کئی قرظی لوگوں کے نام ملتے ہیں جو بنو قریظہ کے بچے تھے لیکن اب وہ احادیث نبوی پڑھاتے رہے۔ بنو قریظہ کے جنگ لوگوں نے بدعہدی نہیں کی تھی، انہیں چھوڑ دیا گیا۔ اس فیصلے کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جنگ خندق میں آنے والے ایک زخم کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاعات ملیں کہ مدینہ کے چاروں جانب مختلف قبائل مدینہ پر دوبارہ حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ نے مختلف اوقات میں 12 کے قریب مہمات روانہ کیں جن میں سے ایک میں آپ خود تشریف لے گئے۔ ان مہمات کے نتیجے میں ان قبائل کی قوت ٹوٹ گئی اور مدینہ منورہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

جنگ خندق کے بعد منافقین کا خواتین پر نفسیاتی حملہ (5-8H/627-630CE)

اس کے لیے چند آیات کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائیے کہ اہل ایمان کے مورال کو بہتر کیا گیا ہے۔ اسی آیت میں اسوۃ حسنہ کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہترین نمونہ ثابت ہوا اور ہر کتاب میں اسی اسوۃ حسنہ کی پیروی کی تلقین ملتی ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا. (21) وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا. (22)

اللہ تعالی کے رسول میں آپ کے لیے (اُس وقت ثبات و استقامت (Stability) کا ایک بہترین نمونہ (Excellent Evidence) موجود ہے۔ ان کے لیے جو اللہ تعالی سے ملاقات اور روز آخرت کی توقع رکھتے ہیں چنانچہ اللہ تعالی کو بہت زیادہ یاد رکھتے ہیں۔ سچے اہل ایمان نے جب (سب سے بڑے) لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ تو وہی ہے جسے اللہ تعالی اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا کیونکہ اللہ تعالی اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی ہوتی تھی۔ (ان کے اندر کوئی کمزوری پیدا کرنے کی بجائے) ان کے ایمان و اطاعت ہی کا اضافہ کر دیا ہے۔ (سورۃ الاحزاب 33)

منافقین کا جعلی پراپیگنڈا جاری رہا لیکن ان کے اثرات کم ہونے لگے۔ انہیں اب وہی موقع رہ گیا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فیملی کو ٹارگٹ بنائیں اور اسی طرح صحابیات رضی اللہ عنہن کے خلاف جعلی کہانیاں گھڑیں۔ اللہ تعالی نے سورۃ الاحزاب ہی میں ایسے احکامات دیے کہ پراپیگنڈا ناکام ہوتا چلا گیا۔ ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ہی شادی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا سے ہی شادی ہوئی اور بس۔ مدینہ منورہ میں آ کر اللہ تعالی کا حکم ہوا کہ وہ صابقون الاولون صحابیات سے شادی کریں جو مذہبی جبر، ہجرت اور شوہروں کی شہادت کے نتیجے میں بہت مشکلات میں ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ایک مشرک سے ہوا تھا لیکن دین کی وجہ سے طلاق کر دی تھی۔ سیدہ حفصہ، ام سلمہ، ام حبیبہ، صفیہ اور میمونہ رضی اللہ عنہن کے شوہر شہید ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا یہودی سردار کی بیٹی تھیں جبکہ سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا کے قبیلے سے جنگ ہوئی تھی۔ ان دونوں خواتین سے شادی کے نتیجے میں جنگیں ختم ہو گئیں اور ان کے قبیلے آزاد ہو

گئے۔ سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا مصر سے آئی تھیں اور ان سے شادی کے نتیجے میں مصر بغیر کس جنگ کے فتح ہو گیا تھا اور اہل مصر ایمان لائے تھے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا.(28)وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا.(29)

(اے رسول! اس طرف سے مایوس ہو کر اب یہ منافقین آپ کی فیملی سے متعلق پراپیگنڈا کا فتنہ کرنے لگے ہیں، اس لیے) اے نبی! آپ اپنی خواتین سے فرما دیجیے کہ اگر آپ دنیا کی زندگی اور اس کی انجوائے منٹ کرنا چاہتی ہیں تو آیئے، میں آپ کو عمدہ فائدہ دے کر اچھی طرح آپ کو رخصت کر دوں (تاکہ آپ منافقین کی سازشوں سے بچ سکیں اور انہیں اس دنیا کی تکلیف نہ آئے۔) لیکن اگر آپ اللہ تعالی، اس کے رسول اور آخرت کا گھر حاصل کرنا چاہتی ہیں تو ان معاملات (اس دنیا کی تکلیف) سے بے پرواہ ہو کر اسی (نیکی) کے لیے سرگرم رہیے۔ اس کی وجہ یہ کہ اللہ تعالی نے آپ میں سے خوبی کے ساتھ نباہ کرنے والیوں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

مدینہ منورہ میں شروع میں امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو معاشی مشکلات آئیں۔ اس وقت منافقین کے پراپیگنڈا پر تکلیف بھی تھی تو انہیں اجازت دی گئی کہ وہ چاہیں تو آزادانہ طریقے پر طلاق لے کر کسی بھی صحابی سے شادی کر سکتی ہیں۔ اس آپشن کو کسی بھی خاتون نے قبول نہیں کیا اور وہ انہی مشکلات میں رہیں لیکن ان پر کچھ سخت پابندیاں بھی عائد ہوئیں۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا.(30) وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا.(31) يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ ۚ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا. (32) وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ ۖ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا. (33) وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا.(34)

نبی کی خواتین! آپ میں سے جو کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں گی، ان کے لیے ڈبل عذاب ہے اور یہ اللہ تعالی کے لیے یہ بہت آسان ہے۔ لیکن اگر آپ میں سے جو اللہ تعالی اور اس کے رسول کی فرمانبردار بنی رہیں گی اور نیک عمل کرتی رہیں گی تو انہیں ہم ان کا ڈبل اجر عطا فرمائیں گے اور ان کے لیے ہم نے عزت کا رزق تیار کر رکھا ہے۔ نبی کی خواتین! آپ عام خواتین کی طرح نہیں ہیں۔ اگر آپ اللہ تعالی سے خبردار رہیں گی تو (ان منافقین کے ساتھ) نرمی کا لہجہ اختیار نہ کیجیے گا۔ کیونکہ جس شخص کے دل میں بیماری ہے، وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس لیے آپ مناسب طریقے سے ہی بات کیجیے گا۔

آپ اپنے گھروں ہی میں رہیے گا اور اگلی جاہلیت کا فیشن لے کر باہر نہ جایئے گا۔ نماز کا اہتمام کرتی رہیے، زکوۃ ادا کرتی رہیے جبکہ اللہ تعالی اور اس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہیے گا۔ اہل بیت خواتین! اللہ تعالی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے (کسی بھی پراپیگنڈا کی) گندگی کو دور رکھے

(جو یہ منافقین آپ پر تھوپنا چاہتے ہیں) جبکہ اللہ تعالی چاہتا ہے کہ آپ اور آپ کے گھر والوں کو پوری طرح پاک کیے رکھے۔ (رسول کے گھر میں) اللہ تعالی کی آیات اور اس کی وزڈم کی جو تعلیم دی جاتی ہے، اسی تعلیم کو (آپ خواتین اور بچوں کو) پڑھاتی جایئے گا۔ یقیناً اللہ تعالی بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ (سورۃ الاحزاب 33)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا.(59)

اے نبی! (ان کی حرکتوں سے اپنی حفاظت کے لیے) آپ اپنی بیویوں، بیٹیوں اور سب اہل ایمان خواتین کو ہدایت کر دیجیے کہ وہ اپنی چادروں میں سے کوئی بڑی چادر اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔ اس سے امکان ہے کہ الگ پہچانی جائیں گی تو ستائی نہیں جائیں گی۔ اس کے باوجود (کوئی خطا ہوئی تو) اللہ تعالی بخشنے والا ہے اور اس رب کی شفقت ہمیشہ کے لیے ہے۔ (الاحزاب 33)

اس ماحول میں یہ مشکل تھی کہ گھروں میں واش روم نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ مردوں اور خواتین کو باہر جا کر کسی درخت یا خفیہ جگہ ہی واش روم کی ضرورت آنی پڑتی تھی۔ منافقین کو موقع مل جاتا کہ خواتین کو ہراسمنٹ شروع کرتے۔ اگر انہیں پکڑا جاتا تو وہ کہتے کہ ہم تو اسے اپنی بیوی یا لونڈی سمجھ رہے تھے۔ اللہ تعالی نے اس لیے پابندیاں لگادی کہ منافقین کا موقع ختم ہو جائے۔ اب اگر ریپ کی حرکت کرے تو پھر انہیں سنگسار کر کے موت کی سزا دی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی کو اب ہمیشہ کے لیے پوری امت کی والدہ قرار دیا اور انہیں بتا دیا کہ انتقال کے بعد بھی وہ دوبارہ شادی نہیں کر سکتی ہیں۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ۗ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا.(6)

نبی کا حق تو ان کی امت پر خود ان کی ذات سے بھی زیادہ اہم ہے اور ان نبی کی بیویاں تو ان (امت مسلمہ) کی مائیں ہیں۔ لیکن خونی رشتے رکھنے والے اللہ تعالی کے قانون میں دوسرے تمام مومنین اور مہاجرین کی بہ نسبت ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، سوائے اس کہ اپنے تعلق کے لوگوں سے آپ کوئی حسن سلوک کرنا چاہیں۔ یہ اسی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ (سورۃ الاحزاب 33)

عربوں کے کلچر میں یہ تھا کہ منہ بولے بیٹے کو اپنا حقیقی بیٹا سمجھا تا اور اس طرح بیٹا اپنے والدین کو بھول جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت سے پہلے زید رضی اللہ عنہ کو اپنا بیٹا قرار دیا تھا لیکن اللہ تعالی نے اب اس پر بھی پابندی کر دی۔ اسی آیت میں ختم نبوت کا اعلان بھی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَٰكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا.(40)

محمد آپ کے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالی کے رسول اور انبیاء (کے اختتام) کی مہر (Seal to close securely)

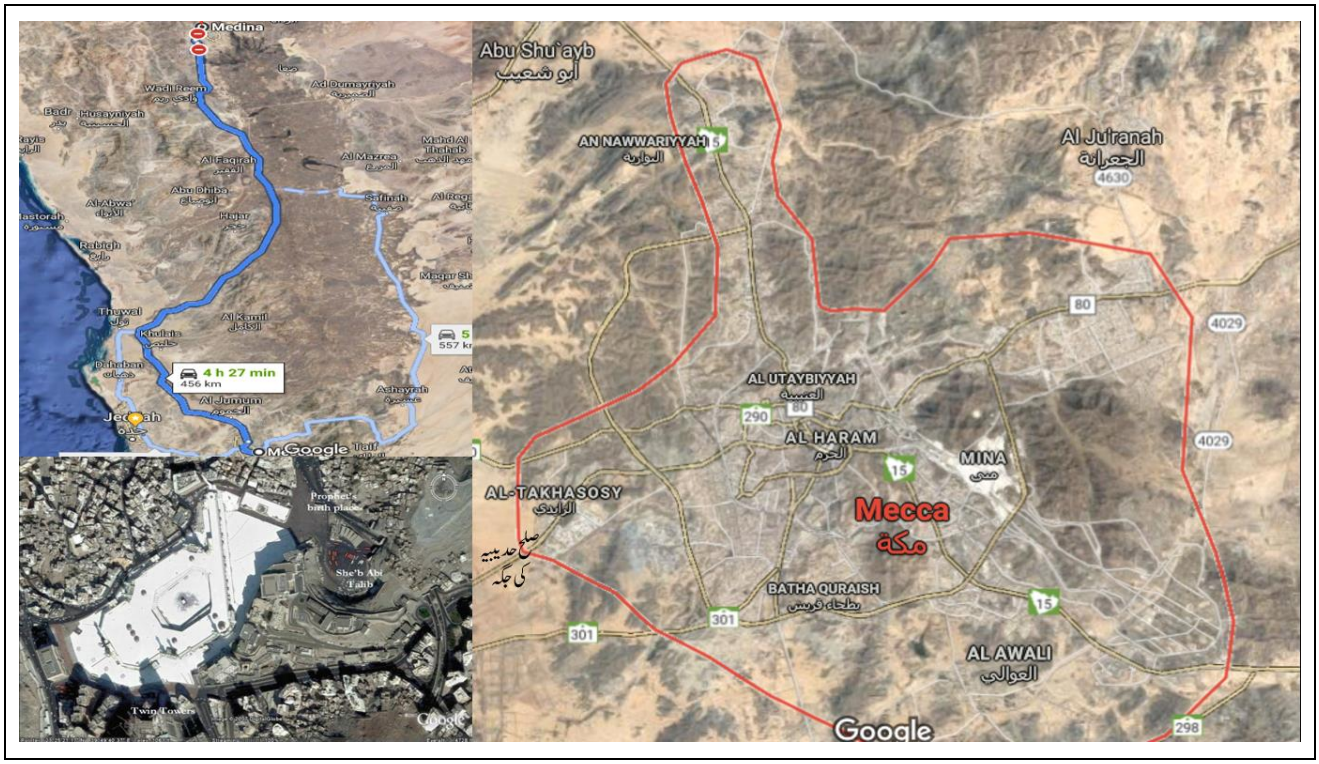
ہیں۔ اللہ تعالی ہر معاملے سے باخبر ہے۔ (سورۃ الاحزاب 33)

اسی آیت میں نبوت کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور بتا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہو سکے گا۔ نبوت کا یہ سلسلہ یہاں پر ختم ہو گیا اور ہدایت کے لیے اللہ تعالی کی کتاب قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات ہی کافی ہوں گے۔

صلح حدیبیہ، جنگ خیبر اور اس کے بعد کا زمانہ(6-8H/628-630CE)

صلح حدیبیہ کا معاہدہ(6H/628CE)

غزوہ خندق کے بعد مدینہ کی ریاست کافی طاقت ور ہو چکی تھی۔ ارد گرد کے قبائل نے اس ریاست کے ساتھ یا تو صلح کے معاہدے کر لیے تھے یا پھر مغلوب ہو چکے تھے۔ اب اسلام کے لیے صرف تین خطرات باقی تھے: ایک اہل مکہ، دوسرے یہود اور تیسرے وہ عرب بدو جو مدینہ پر لوٹ مار کے لیے حملے کیا کرتے تھے۔ 6H/628CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرہ کا ارادہ کیا اور احرام باندھ کر 1400 صحابہ کے ساتھ مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ اہل مکہ نے آپ کو روکنے کے لیے ایک دستہ بھیجا لیکن مسلمانوں نے مقابلے کی بجائے دوسرا راستہ اختیار کیا اور بالآخر مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔



نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کو پیغام بھیجا کہ آپ کا ارادہ جنگ کا نہیں بلکہ صرف عمرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر قریش چاہیں تو آپ صلح کا معاہدہ کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر ان کے

پاس بھیجا کیونکہ ان کے چچا ابو سفیان ہی مکہ کے سردار تھے۔ انہوں نے حضرت عثمان کو روک دیا اور پراپیگنڈا یہ کر دیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس دور کے بین الاقوامی قانون میں سفیر کے قتل کو ہر قوم ناجائز سمجھتی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ سے بیعت لی جو کہ "بیعت رضوان" کہلاتی ہے۔

قریش کے معقول لوگوں نے اپنی قوم کو صلح کی ترغیب دی اور ان کے سفیر سہیل بن عمرو (جو بعد میں ایمان لائے) نے آکر صلح کا معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کی شرائط میں یہ بات شامل تھی کہ دونوں فریق 10 سال تک جنگ نہیں کریں گے۔ عرب قبائل جس فریق سے بھی ملنا چاہیں، ان پر کوئی پابندی نہ ہو گی۔ اگر کوئی قبیلہ مسلمانوں سے معاہدہ کرنا چاہے تو قریش کو اس پر اعتراض نہ ہو گا اور اسی طرح اگر کوئی قبیلہ قریش سے ملنا چاہے تو مسلمان اس پر اعتراض نہیں کریں گے اور یہ قبائل بھی اس صلح میں شریک ہوں گے۔ اسی معاہدہ کو اللہ تعالی نے "فتح مبین" قرار دیا اور سورۃ الفتح نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ. إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا. (1) لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا. (2) وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا. (3) هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ ۗ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا. (4)

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے کیونکہ اس رب کی شفقت ہمیشہ کے لیے ہے۔ (اے رسول!) یقیناً ہم نے آپ کو کھلی فتح عطا کر دی ہے۔ (آپ کامیابی کے ساتھ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیے اور اس کے صلے میں) اللہ تعالی اگلے اور پچھلے سب (منافقین کے جھوٹے پراپیگنڈا والی) کوتاہیوں کو آپ سے پاک کر دے اور آپ پر اپنی نعمت مکمل کر دے اور آپ کے لیے ایک سیدھی راہ کھول دے۔ اللہ تعالی آپ کو ایسی مدد کرے جو ناقابل شکست ہو۔ وہی ہے جس نے (فتح کے اس سفر کے لیے نکلتے وقت) مسلمانوں کے دلوں میں اطمینان نازل فرمایا تاکہ (وہ نکلیں اور اس کے صلے میں) ان کے ایمان میں مزید اضافہ کر دے۔ زمین اور آسمانوں کے تمام لشکر اللہ تعالی ہی کے ہیں اور اللہ تعالی علم اور حکمت کا مالک ہے۔ (سورۃ الفتح 48)

پورے عرب کے تمام قبائل اس لیے تذبذب میں تھے کہ وہ قریش ہی کو اپنا مذہبی لیڈر سمجھتے تھے کیونکہ وہ حرم شریف کے ذمہ دار تھے اور حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام کی نسل سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کرنے میں انہیں ڈر لگتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی امت سے نکل جائیں۔ جب اہل قریش سے آزادانہ معاہدہ ہو گیا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تیزی سے ہر قبیلے تک پہنچنے لگی اور بہت سے لوگ ایمان لانے لگے۔

تلخ شرائط میں یہ بات تھی کہ اگر اہل مکہ میں سے کوئی اسلام قبول کر کے مدینہ جائے تو مسلمان اسے واپس کرنے پر مجبور ہوں گے اور اگر مسلمانوں میں سے کوئی مرتد ہو کر مکہ آئے تو اسے واپس نہ کیا جائے گا۔ بعض صحابہ کو اس شرط پر تردد ہوا لیکن پہلی دو شرائط مسلمانوں کے حق میں تھیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول کر لیا۔ معاہدے کے دوران ہی سہیل بن عمرو کے بیٹے ابو جندل رضی اللہ عنہ بھاگ کر آ گئے مگر انہیں معاہدے کے تحت واپس کر دیا گیا۔ اس معاہدے کو اللہ تعالی نے سورۃ الفتح میں "فتح

مبین" قرار دیا۔

معاہدے کی شرائط کا مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا۔ جو عرب قبائل قریش کے احترام کی وجہ سے مسلمانوں سے معاملہ کرنے میں متردد تھے، اب ان سے معاہدے ہونے لگے اور اسلام کی دعوت تیزی سے عرب قبائل میں پھیلنے لگی۔ خود اہل مکہ میں اسلام کی دعوت پھیلنے لگی۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ 6H/627CE میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد 1400 تھی جو عمرہ کے لیے آئے تھے لیکن صرف دو سال کے بعد ان کی تعداد 10,000 ہو گئی۔

جنگ خیبر (7H/628CE)

اس طرح اسلام کو درپیش ایک بڑا خطرہ یعنی اہل مکہ ختم ہو گئے لیکن دوسرا خطرہ یہود ابھی باقی تھے۔ مدینہ سے جلاوطن ہونے والے یہودی اب خیبر میں آباد ہو چکے تھے جو مدینہ سے شمال میں 170 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بڑا نخلستان ہے۔ صحرا میں نخلستان بہت اہم ہے کہ اس میں پودے پیدا ہو سکتے ہیں اور یہ نخلستان اگریکلچر ایج کی شاندار اکنامکس تھی۔ یہاں یہودیوں نے مدینہ پر فیصلہ کن حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ خیبر میں متعدد مضبوط قلعے تھے جن کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں کھجوروں کے باغات تھے اور بہت بڑا زرعی علاقہ تھا جس کی وجہ سے یہ ایک خوشحال نخلستان تھا۔



خیبر کے قلعے کے آثار قدیمہ

7H/628CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعت رضوان میں شریک صحابہ کے ہمراہ خیبر پر لشکر کشی کی۔ خیبر کے سبھی

قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہوتے چلے گئے۔ اس میں حضرت علی، زبیر اور ابو دجانہ رضی اللہ عنہم نے غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔[35] بعض قلعے صلح سے فتح ہوئے اور اس کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔

سب سے مشکل قلعہ یہ تھا جس کی تصویر آپ دیکھ رہے ہیں۔ کئی مرتبہ اس پر حملہ کی کوشش کی گئی لیکن یہود اوپر سے پتھر پھینک کر جنگ نہ ہونے دیتے تھے۔ آخر کار علی رضی اللہ عنہ نے یہود کے سب سے بڑے جنگجو حیئ بن اخطب کو چیلنج دیا تو وہ پھر مقابلے پر آ نکلا اور پھر علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اسی حیئ کی بیٹی سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی اور نتیجے میں تمام یہودیوں نے جنگ نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔

جنگ کے بعد خیبر کی زمینیں مسلمانوں کے حصے میں آئیں۔ یہودیوں کی درخواست تھی کہ ہمیں خیبر میں رہنے دیں اور کاشت کاری ہم کریں گے تو ساری آمدنی آپ کی ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبول کر لیا اور بتا دیا کہ پیداوار کا نصف ان کا اور نصف مسلمانوں کا ہوا کرے گا۔[36] اس کے بعد ہر سال حکومتی خزانہ کے لیے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ آتے تو وہ اس طرح برابر تقسیم کرتے کہ یہودی روتے ہوئے کہتے کہ یہ عدل ہے کہ جس سے زمین اور آسمان چلتے ہیں۔

خیبر کی نصف زمین کے 1800 حصے کر کے اسے مسلم فوج میں تقسیم کیا گیا جن میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصے میں آیا۔ بقیہ نصف سرکاری ملکیت قرار دی گئی تاکہ مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ خیبر کی فتح کے بعد مسلمانوں کی معاشی حالت بہت بہتر ہوئی اور انہیں زرخیز زمین کی پیداوار کا بڑا حصہ ملنے لگا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ خیبر سے ہی ہماری تمام معاشی مشکلات ختم ہو گئیں جو کئی سال سے ہوتی تھیں۔

خیبر کے بعد دوسرے علاقوں کے یہودیوں نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ ان میں فدک اور تیاء کے یہودیوں نے بغیر جنگ کے، جبکہ وادی القری کے یہود نے معمولی سی جھڑپ کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح سے شمالی عرب کا پورا علاقہ اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔ اس کے بعد یہودیوں نے 1948CE میں اسرائیل کے قیام تک مسلمانوں سے کبھی جنگ نہ کی بلکہ مصالحت کے ساتھ ان کے زیر سایہ رہتے رہے۔ خود یہودی اسکالرز نے اپنی تاریخ لکھی ہے تو وہ بیان کرتے ہیں کہ ہماری تاریخ میں سب سے بڑا امن ہمیں مسلمانوں کے ساتھ ہی رہا ہے۔ مارک کوہن لکھتے ہیں۔

> Though the religious minorities (Jews living under Christian rule; Jews and Christians living under Muslim rule) were hardly happy with their second-class status and legal inferiority, let alone the occasional persecutions, for the most part they accepted their inequality and subordination with resignation. As long as they were allowed to live in security and practice their religion without interference. **(Mark R. Cohen, Jewish History**

---

[35] بخاری۔ کتاب المغازی۔ حدیث 3973

[36] بخاری۔ کتاب المزارعۃ۔ حدیث 2203

in the Muslim World)

جنگ خیبر کے بعد اسلام جزیرہ نما عرب کی سب سے بڑی طاقت بن چکا تھا۔ اس کے دشمنوں میں سے یہود اطاعت قبول کر چکے تھے اور اہل مکہ کے ساتھ صلح کا معاہدہ تھا۔ اب تیسرا خطرہ باقی تھا جو متفرق عرب قبائل پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ موقع دیکھ کر مدینہ پر چھوٹے موٹے حملے کر دیتے اور مویشی لوٹ کر فرار ہو جاتے۔ ان کی سرکوبی ایک مشکل کام تھا کیونکہ یہ کسی ایک جگہ نہیں رہتے تھے بلکہ حملہ کر کے صحرا میں فرار ہو جایا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 16-15 مہمات روانہ کیں تاکہ ان قبائل پر رعب ڈالا جا سکے اور یہ مدینہ پر حملہ نہ کر سکیں۔

7H/629CE ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرہ ادا کیا اور آپ کی کاوشوں کے سبب اہل مکہ میں اسلام کی دعوت پھیلنے لگی اور ان کے بڑے اور نمایاں لوگوں میں حضرت خالد بن ولید، عمرو بن عاص اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم ایمان لائے۔ یہ تینوں الگ الگ نکلے تو راستے میں ملاقات ہوئی۔ جب معلوم ہوا کہ وہ مدینہ منورہ جا رہے ہیں تو پھر اکٹھے گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کر لی۔ اس کے بعد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ امت مسلمہ کے سب سے بڑے کمانڈر ان چیف بنے جبکہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جب مصر فتح کی تو وہ یہاں کے گورنر بنے۔

اسی زمانے میں مکہ مکرمہ میں قحط پڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مدد کے لیے کھجوریں بھیجیں۔ اس سے بھی ان کے دل تبدیل ہونا شروع ہوئے اور نفرت کی جگہ محبت پیدا ہونے لگی۔ اسلام کی پے در پے کامیابیوں نے بھی بہت سے اہل مکہ کے دل کی دنیا تبدیل کر دی۔

دنیا کے بادشاہوں کے نام خطوط

6-7H/628-629CE کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گرد و پیش کی سلطنتوں کے سربراہوں کے نام خطوط لکھے جن میں انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔ ان خطوط میں صرف ایمان کی دعوت ہی نہیں بلکہ وارننگ بھی شامل ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو پھر ان کی حکومت ختم ہو جائے گی۔

ان میں روم کا بادشاہ ہرقل، ایران کا بادشاہ خسرو پرویز، حبشہ کا بادشاہ نجاشی، مصر کا بادشاہ مقوقس، بحرین کا بادشاہ منذر بن ساوی، یمامہ کا قبائلی لیڈر ہوذہ بن علی، عمان کے دو بادشاہ جیفر اور عبد، اور غسان کا بادشاہ حارث شامل تھے۔ ان خطوط کا مضمون کم و بیش یکساں تھا سوائے اس کے کہ عیسائی بادشاہوں کو توحید کے مشترک عقیدے کو اختیار کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان میں سے حبشہ، بحرین اور عمان کے بادشاہوں نے اسلام قبول کیا۔ مصر اور روم کے بادشاہ احترام سے پیش آئے جبکہ ایران اور غسان کے بادشاہوں نے بدتمیزی کی۔

سب سے دلچسپ حدیث ہے کہ قیصر ہرقل کی ملاقات ابوسفیان سے ہوئی اور اس خط پر گفتگو کی تھی۔ ابوسفیان ابھی ایمان نہیں لائے

تھے بلکہ وہ دو تین سال پہلے ہی جنگ احد اور جنگ خندق کے کمانڈر ان چیف تھے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ابوسفیان بن حرب نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ہرقل (بادشاہ روم) نے ان کے پاس قریش کے قافلے میں ایک آدمی بلانے کو بھیجا اور اس وقت یہ لوگ تجارت کے لیے ملک شام (سیریا) گئے ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش اور ابوسفیان سے ایک وقتی معاہدہ کیا ہوا تھا۔ جب ابوسفیان اور دوسرے لوگ ہرقل کے پاس ایلیاء (یروشلم) پہنچے جہاں ہرقل نے دربار طلب کیا تھا۔ اس کے گرد روم کے بڑے بڑے لوگ (علماء، وزراء اور امراء) بیٹھے ہوئے تھے۔

ہرقل نے انہیں اور اپنے ترجمان کو بلوایا۔ پھر ان سے پوچھا کہ آپ میں سے کون شخص مدعی رسالت (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا زیادہ قریبی عزیز ہے؟

ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں بول اٹھا کہ میں ان رسول اللہ کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار (والد کے کزن اور سسر) ہوں۔

ہرقل نے حکم دیا کہ انہیں (ابوسفیان کو) میرے قریب لے کر بٹھائیں اور اس کے ساتھیوں کو ان کی پیٹھ کے پیچھے بٹھا دیں۔ پھر اپنے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں ابوسفیان سے اس شخص کے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) حالات پوچھتا ہوں۔ اگر یہ مجھ سے کسی بات میں جھوٹ بول دے تو آپ اس کا جھوٹ ظاہر کر دینا۔

(ابوسفیان کہتے ہیں) اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ غیرت نہ آتی کہ یہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ضرور غلط گوئی سے کام لیتا۔ خیر پہلی بات جو ہرقل نے مجھ سے پوچھی کہ اس شخص (رسول اللہ) کا خاندان آپ لوگوں میں کیسا ہے؟

میں نے کہا کہ وہ تو بڑے اونچے اعلیٰ نسب والے ہیں۔

ہرقل کہنے لگا کہ اس سے پہلے بھی کسی نے تم لوگوں میں ایسی (نبوت کا دعوی) کیا تھا؟

میں نے کہا کہ نہیں۔

ہرقل کہنے لگا: اچھا اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟

میں نے کہا کہ نہیں۔

پھر ہرقل نے کہا: بڑے لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے یا کمزوروں نے؟ میں نے کہا نہیں کمزوروں نے۔ اس کے تابعدار روز بڑھتے جاتے ہیں یا کوئی ساتھی پھر بھی جاتا ہے؟

میں نے کہا کہ نہیں۔

ہرقل کہنے لگا کہ کیا اپنے اس دعوی (نبوت) سے پہلے کبھی (کسی بھی موقع پر) اس نے جھوٹ بولا ہے؟

میں نے کہا کہ بالکل نہیں۔ اور اب ہماری اس سے (صلح کی) ایک مقررہ ٹائم طے ہوا ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ اس میں کیا کریں گے۔ (ابوسفیان کہتے ہیں) میں اس بات کے سوا اور کوئی (جھوٹ) اس گفتگو میں شامل نہ کر سکا۔

ہرقل نے کہا: کیا محمد سے آپ کی کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے؟

ہم نے کہا کہ ہاں۔

بولا کہ پھر تمہاری اور اس کی جنگ کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟

میں نے کہا: لڑائی ڈول کی طرح ہے، کبھی وہ ہم سے (میدان جنگ) جیت لیتے ہیں اور کبھی ہم بھی ان سے جیت لیتے ہیں۔

ہرقل نے پوچھا: وہ آپ کو کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟

میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کریں، اس کا کسی کو شریک نہ قائم کریں اور اپنے باپ دادا کی (شرک کی) باتیں چھوڑ دیں۔ وہ ہمیں نماز پڑھنے، سچ بولنے، پرہیز گاری اور صلہ رحمی کی تلقین کرتے ہیں۔

(یہ سب سن کر) پھر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے کہہ دیجیے کہ میں نے آپ سے ان نبی کا نسب پوچھا تو آپ نے بتایا کہ وہ ہم میں اعلی نسب کے ہیں اور پیغمبر اپنی قوم میں اعلی نسب ہی کے ہوتے ہیں۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ (دعویٰ نبوت کی) یہ بات تمہارے اندر اس سے پہلے کسی اور نے بھی کہی تھی، تو تم نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب میں نے (غور کیا) کہ اگر یہ بات اس سے پہلے کسی نے کہی ہوتی تو میں سمجھتا کہ اس شخص نے بھی اسی بات کی تقلید کی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے۔

میں نے آپ سے پوچھا کہ اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہے تو آپ نے کہا کہ نہیں۔ تو میں نے (ذہن میں سوچا) کہ ان کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہو گا تو کہہ دوں گا کہ وہ شخص (اس بہانہ) اپنے آباء واجداد کی بادشاہت اور ان کا ملک (دوبارہ) حاصل کرنا چاہتا ہے۔

میں نے آپ سے پوچھا کہ اس بات کے کہنے (یعنی پیغمبری کا دعویٰ کرنے) سے پہلے آپ نے کبھی انہیں دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے؟ تو آپ نے کہا کہ نہیں۔ تو میں نے سمجھ لیا کہ جو شخص آدمیوں کے ساتھ جھوٹ سے بچتے ہیں وہ اللہ تعالی کے بارے میں کیسے جھوٹی بات کہہ سکتے ہیں
۔

میں نے آپ سے پوچھا کہ بڑے لوگ اس کے پیرو ہوتے ہیں یا کمزور آدمی۔ آپ نے بتایا کہ کمزوروں نے اس کی اتباع کی ہے، تو (دراصل) یہی لوگ پیغمبروں کے پیروکار ہوتے ہیں۔

میں نے آپ سے پوچھا کہ اس کے ساتھی بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں۔ تو آپ نے کہا کہ وہ بڑھ رہے ہیں اور ایمان کی کیفیت یہی ہوتی ہے۔ حتی کہ وہ کامل ہو جاتا ہے۔

میں نے آپ سے پوچھا کہ آیا کوئی شخص اس کے دین سے ناخوش ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے تو آپ نے کہا کہ نہیں۔ تو ایمان کی خاصیت بھی یہی ہے جن کے دلوں میں اس کی مسرت رچ بس جائے وہ اس سے لوٹا نہیں کرتے۔

میں نے آپ سے پوچھا کہ آیا وہ کبھی عہد شکنی کرتے ہیں۔ تو آپ نے کہا کہ نہیں۔ پیغمبروں کا یہی حال ہوتا ہے، وہ عہد کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

میں نے آپ سے کہا کہ وہ آپ سے کس کی دعوت دیتے ہیں۔ تو آپ نے کہا کہ وہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور وہ آپ کے بتوں کی پرستش سے روکتے ہیں۔ سچ بولنے اور پرہیز گاری کی تلقین کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ باتیں جو آپ نے کہی اگر سچ ہیں تو عنقریب وہ رسول اللہ اس جگہ کا مالک ہو جائیں گے کہ جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ (رسول

) آنے والا ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ (عربوں کے) اندر ہوں گے۔ اگر میں جانتا کہ اس تک پہنچ سکوں گا تو ان سے ملنے کے لیے ہر تکلیف گوارا کرتا۔ اگر میں ان کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔

ہر قل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط منگایا جو آپ نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حاکم بصریٰ کے پاس بھیجا تھا اور اس نے وہ ہر قل کے پاس بھیج دیا تھا۔ پھر اسے پڑھا تو اس میں (لکھا تھا):

"اللہ کے نام کے ساتھ جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔ اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ خط ہے شاہ روم کے لیے۔ اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے اس کے بعد میں آپ کے سامنے دعوت اسلام پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اسلام لے آئیں گے تو (دین و دنیا میں) سلامتی نصیب ہو گی۔ اللہ تعالی آپ کو دوہرا ثواب دے گا اور اگر آپ (میری دعوت سے) روگردانی کریں گے تو آپ کی رعایا کا گناہ بھی آپ پر ہی ہو گا۔

اے اہل کتاب! ایک ایسی بات پر آجایئے جو ہمارے اور آپ کے درمیان یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم اللہ تعالی کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ تعالی کے سوا اپنا رب بنائے۔ پھر اگر وہ اہل کتاب (اس بات سے) منہ موڑ لیں تو (اہل ایمان!) آپ ان سے کہہ دیجیے کہ (تم مانو یا نہ مانو) ہم تو ایک اللہ کے اطاعت گزار ہیں۔"

ابوسفیان کہتے ہیں: جب ہر قل نے جو کچھ کہنا تھا تو کہہ دیا اور خط پڑھ کر فارغ ہوا تو اس کے ارد گرد بہت شور و غوغہ ہوا، بہت سی آوازیں اٹھیں اور ہمیں باہر نکال دیا گیا۔ تب میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابو کبشہ کے بیٹے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا ہے۔ (ذرا دیکھو تو سہی کہ) اس رسول سے بنی اصفر (روم) کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔ مجھے اس وقت سے اس بات کا یقین ہو گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عنقریب غالب ہو کر رہیں گے۔ حتیٰ کہ اللہ نے مجھے بھی ایمان لانے دیا۔

(راوی کا بیان ہے کہ) ابن ناطور یروشلم کا گورنر، ہر قل کا ساتھی اور شام کے نصاریٰ کا لاٹ پادری بیان کرتا تھا کہ ہر قل جب یروشلم آیا، ایک دن صبح کو پریشان اٹھا تو اس کے درباریوں نے دریافت کیا کہ آج ہم آپ کی حالت تبدیل ہوتے دیکھا ہیں۔ (کیا وجہ ہے؟)

ابن ناطور کا بیان ہے کہ ہر قل نجومی تھا اور علم نجوم میں وہ پوری مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ہم نشینوں کو بتایا کہ میں نے آج رات ستاروں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ ہمارے ملک پر غالب آگیا ہے۔ اس زمانے میں کون لوگ ختنہ کرتے ہیں؟

گورنر اور پادری نے کہا کہ یہود کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا چنانچہ ان کی وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ سلطنت کے تمام شہروں میں یہ حکم لکھ بھیجئے کہ وہاں جتنے یہودی ہوں سب قتل کر دیئے جائیں۔

وہ لوگ انہی باتوں میں مشغول تھے کہ ہر قل کے پاس ایک آدمی لایا گیا۔ جسے شاہ غسان نے بھیجا تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات بیان کئے۔ جب ہر قل نے (سارے حالات) سن لیے تو کہا کہ جا کر دیکھو وہ رسول ختنہ کئے ہوئے ہے یا نہیں؟

انہوں نے بتایا کہ وہ ختنہ کیا ہوا ہے۔

ہر قل نے جب اس شخص سے عرب کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتلایا کہ وہ ختنہ کرتے ہیں۔

تب ہر قل نے کہا کہ یہی (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس امت کے بادشاہ ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے اپنے ایک دوست کو رومیہ خط

لکھا اور وہ بھی علم نجوم میں ہرقل کی طرح ماہر تھا۔ پھر وہاں سے ہرقل حمص چلا گیا۔ ابھی حمص سے نکلا نہیں تھا کہ اس کے دوست کا خط (اس کے جواب میں) آ گیا۔ اس کی رائے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بارے میں ہرقل کے مطابق تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (سچے) پیغمبر ہیں۔

اس کے بعد ہرقل نے روم کے بڑے آدمیوں کو اپنے حمص کے محل میں طلب کیا اور اس کے حکم سے محل کے دروازے بند کر لیے گئے۔ پھر وہ (اپنے خاص محل سے) باہر آیا اور کہا: "اے اہل روم! کیا ہدایت اور کامیابی میں کچھ حصہ تمہارے لیے بھی ہے؟ اگر تم اپنی سلطنت کی بقا چاہتے ہو تو پھر اس نبی کی بیعت کر لو اور مسلمان ہو جاؤ۔"

(یہ سننا تھا کہ) پھر وہ لوگ وحشی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑے (مگر) انہیں بند پایا۔ آخر جب ہرقل نے ان کی یہ نفرت دیکھی اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا تو کہنے لگا کہ ان لوگوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں نے جو بات کہی تھی، اس سے تمہاری دینی پختگی کی آزمائش مقصود تھی سو وہ میں نے دیکھ لی۔ تب (یہ بات سن کر) وہ سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور اس سے خوش ہو گئے۔ بالآخر ہرقل کی آخری حالت یہی رہی۔ [صحیح البخاري / کتاب بدء الوحی / حدیث:7]

ایک خط اردن کے علاقے بلقاء کے غسانی گورنر شرحبیل بن عمرو کو بھی بھیجا گیا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امبیسڈر حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کروا دیا۔ یہ بین الاقوامی قانون کے تحت ایک بدترین جرم تھا اور اس کی سزا دینے کے لیے رسول اللہ نے 3000 افراد پر مشتمل ایک فوج حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں وہاں روانہ کی۔ اس کی اطلاع ملتے ہی قیصر روم نے اپنی ایک لاکھ یا دو لاکھ فوج مدد کے لیے بھیج دی۔

اردن میں موتہ کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی جس میں یکے بعد دیگرے حضرت زید، جعفر اور عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم لشکر اسلام کی قیادت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے بعد نئے مسلم خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی اور اپنی غیر معمولی عسکری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے لشکر اسلامی کو بحفاظت نکال لائے۔ یہ رومن ایمپائر کے ساتھ مسلمانوں کی پہلی جنگ تھی جس کے نتیجے میں پورے شمالی عرب میں مسلمانوں کا رعب پیدا ہوا اور یہاں کے قبائل بنو سلیم، اشجع، غطفان، ذبیان اور فزارہ ایمان لائے۔ یہ وہ قبائل تھے جو عرصے سے مدینہ کی ریاست کے لیے مسئلہ بنے ہوئے تھے۔

فتح مکہ، عام الوفود، غزوۃ تبوک اور حج الوداع (8-11/630-632)

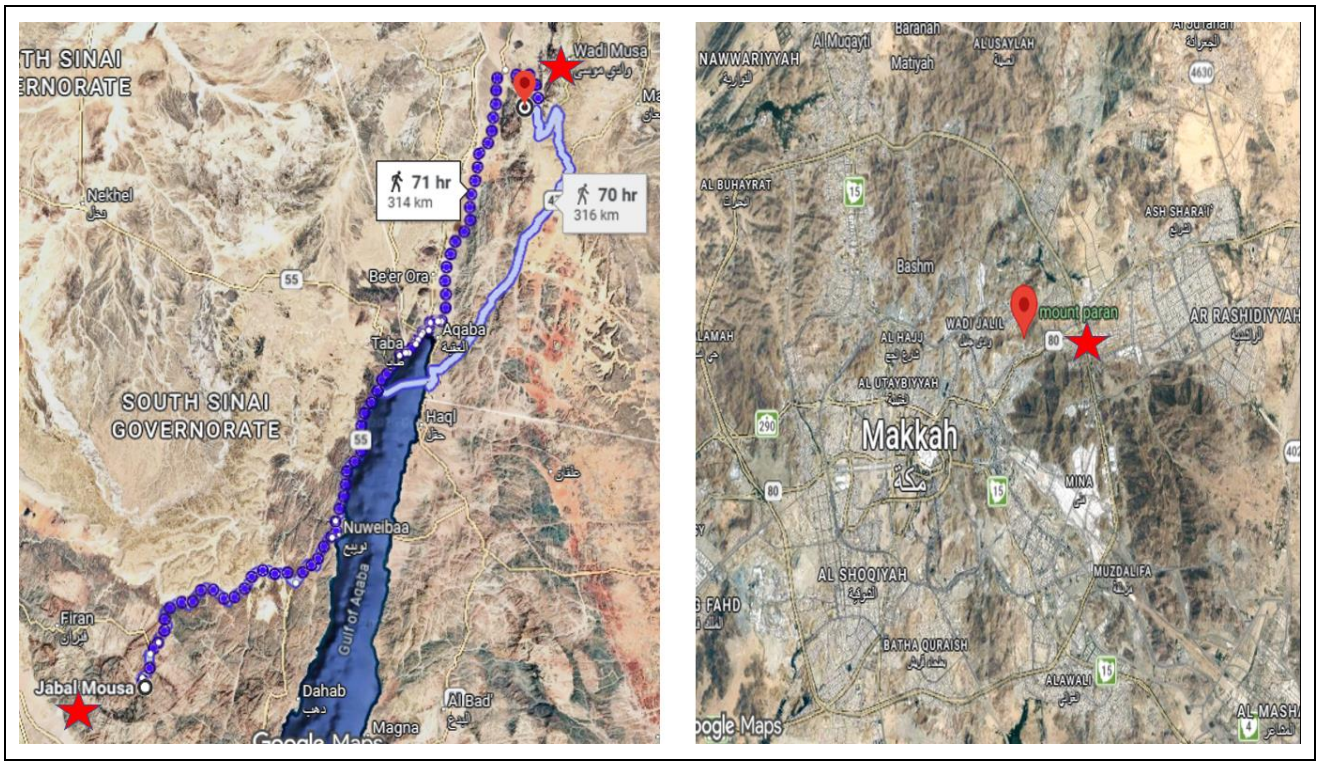
فتح مکہ (8H/630CE)

حدیبیہ کے معاہدے میں یہ شرط شامل تھی کہ مسلمانوں اور اہل مکہ کے حلیف قبائل بھی صلح میں شریک ہوں گے اور ان کے خلاف کوئی اقدام اس معاہدے کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔ اس معاہدے کے تحت بنو خزاعہ نامی قبیلہ مسلمانوں کے اور بنو بکر نامی قبیلہ اہل مکہ کا حلیف بنا تھا۔ بنو خزاعہ کے لوگ ایمان لا چکے تھے۔ ان میں پرانی دشمنی تھی چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھا کر بنو بکر نے بنو خزاعہ پر بے

خبری میں حملہ کر دیا اور اہل مکہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ بنو خزاعہ نے پسپا ہو کر حرم مکہ میں پناہ لی اور اپنا ایک قاصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روانہ کیا جس نے پوری بات بتائی۔ آپ نے معاہدے کی اس خلاف ورزی پر مکہ مکرمہ پر حملے کا ارادہ کر لیا۔[37]

ادھر قریش کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ان کے سربراہ ابوسفیان مدینہ آئے تاکہ معاہدے کی تجدید کر سکیں۔ اب وہ اپنی بیٹی ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر ٹھہرے اور انہوں نے اپنی بیٹی سے سفارش کروانے کی کوشش کی لیکن سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ٹکا سا جواب دیا۔ پھر اب ابوسفیان نکل کر حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے پاس پہنچے اور ان سے سفارش کروانی چاہی مگر انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے ابوسفیان خود ہی معاہدے کی تجدید کا اعلان کر کے چلے گئے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 10,000 کا ایک لشکر جرار تیار کیا۔ تین سال پہلے غزوہ خندق کے موقع پر مسلمانوں کا لشکر محض 3000 تھا جبکہ صلح حدیبیہ میں صرف 1400 صحابہ تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تین سال کے عرصے میں کتنے لوگ اسلام قبول کر چکے تھے۔ آپ کا پلان یہ تھا کہ مکہ کو بغیر جنگ کے فتح کیا جائے۔ اس لیے آپ نے نہایت رازداری سے سفر جاری رکھا اور مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر پوری فوج کو پھیلا دیا اور حکم دیا کہ ہر شخص اپنا اپنا کھانا پکانے کے لیے الگ الگ جگہ آگ جلائے۔



[37] مبارک پوری "الرحیق المختوم" اور ندوی "رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم" کتابوں میں حوالے ہیں لیکن معذرت کہ ٹائم کے ساتھ صفحے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

یہ پیش گوئی حقیقت میں آگئی جو اس سے پہلے تورات میں بیان ہوا ہے۔

خداوند **سینا** سے آیا اور **شعیر** سے ان پر آشکار ہوا۔ وہ **کوہِ فاران** سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں میں سے آیا...اس کے داہنے ہاتھ میں ان کے لئے آتشی شریعت تھی۔(استثنا33:2)

And he said, The LORD came from **Sinai,** and rose up from **Seir** unto them; he shined forth from **mount Paran**, and he came with ten thousands of saints: from his right hand went a fiery law for them. (Deuteronomy 33:2)

بعض ترجموں میں 10,000 قدوسیوں کا ذکر ہے اور بعض ترجموں میں لاکھوں کا ذکر ہے۔ لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ اللہ تعالی نے ہر رسول کی دعوت کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی مدد کے ساتھ ان کی فتوحات ہوئیں۔ سینا مصر کا جزیرہ نما علاقہ ہے جس میں طور پہاڑ ہے جہاں حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس تورات نازل ہوئی اور یہیں سے فتوحات شروع ہوئیں۔ پھر اردن میں شعیر پہاڑ سے جہاں حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام فتح کرتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد آپ کے خلفاء راشدین یشوع اور کالب رضی اللہ عنہما نے فلسطین، سیریا اور لبنان فتح کیے۔

کوہ فاران مکہ مکرمہ کے بالکل پاس ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی جنگ کے بغیر فتح کر دی۔ بنی اسرائیل میں چونکہ عربوں پر تعصب تھا، اس لیے انہوں نے اپنے ترجموں میں فاران، صفا اور مروہ کو تبدیل کر دیا تاکہ وہ مکہ مکرمہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام سے تعلق غائب کر سکیں لیکن ناکام رہے۔ اگر آپ عربی جانتے ہیں تو اس کے لیے آپ بائبل کی پانچویں کتاب استثناء کا اور یجنل عبرانی زبان میں پڑھ لیجیے تو آپ اس پیش گوئی کی ریسرچ کر سکتے ہیں۔ عبرانی اور عربی زبان میں زیادہ فرق نہیں ہے جیسا کہ ہمارے ہاں اردو اور ہندی ملتی جلتی ہیں۔

اہل مکہ کو اس کی اطلاع ملی تو اس وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مشورے پر مکہ کے سردار ابوسفیان خود نکلے اور دور دور تک پھیلی ہوئی آگ کا نظارہ کر کے بہت مرعوب ہوئے۔ بعض فوجیوں نے انہیں گرفتار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا دیا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتہائی حسن سلوک کیا اور اس دن حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی ایمان لے آئے۔ اسی وقت عباس رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ آپ حرم شریف یا پھر ابوسفیان کے گھر کو امن کا اعلان کر لیجیے تاکہ اہل مکہ وہاں آکر سرنڈر کر دیں۔

اگلی صبح لشکر مکہ میں اس شان سے داخل ہوا کہ قریش مقابلہ نہ کر سکے۔ بعض جذباتی نوجوانوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دستے پر حملہ کیا لیکن خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام اعلان کروا دیا کہ جو شخص خانہ کعبہ میں چلا جائے، یا حضرت ابوسفیان کے گھر چلا جائے یا اپنے ہی گھر کا دروازہ بند کر لے، اس کے لیے امان ہے۔

تھوڑی سی دیر میں مکہ مکرمہ فتح ہو گیا اور صرف چند افراد ہی اس معرکے میں قتل ہوئے۔ فتح کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم اس عجز وانکسار کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے کہ آپ کا سر مبارک اونٹ کے کوہان سے سجدہ کے طور پر ٹکرا رہا تھا۔ آپ بیت اللہ تشریف لے گئے اور یہاں نماز پڑھی۔ پھر بیت اللہ میں تمام بتوں اور تصاویر سے پاک کر دیا۔ آپ کے دست مبارک میں ایک چھڑی تھی جس سے آپ بت گراتے جاتے تھے اور ساتھ **جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا** (حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل یقیناً مٹنے ہی والا ہے) کی تلاوت فرما رہے تھے۔

قریش اب خانہ کعبہ کے سامنے جمع تھے۔ ان امور سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا: ''اے اہل قریش! اللہ نے آپ سے جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا پر فخر کا خاتمہ کر دیا ہے۔ سب لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔'' پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ.

اے انسانو! ہم نے آپ سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے تخلیق کیا اور آپ کو قومیں اور قبیلے اس لیے بنانے دیے کہ آپ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تو سب سے زیادہ باعزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، یقیناً اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔ (الحجرات 49:13)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش سے پوچھا: ''آپ لوگوں کے خیال میں میں آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟'' انہوں نے عرض کیا: ''آپ کریم بھائی ہیں اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''تو پھر میں آپ سے وہی بات کہوں گا جو یوسف علیہ الصلوۃ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: **لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (آج آپ پر کوئی سرزنش نہیں ہو گی۔) جایئے آپ سب آزاد ہیں۔'' اس کریمانہ سلوک پر قریش کے دل کی دنیا بدل گئی اور وہ سب کے سب ایمان لے آئے۔

نو دس کے قریب ایسے افراد تھے، جنہوں نے اسلام سے غیر معمولی دشمنی پال رکھی تھی اور بڑے جنگی جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں حکم جاری کر رکھا تھا کہ انہیں ہر صورت قتل کر دیا جائے۔ لیکن ان میں سے چار افراد کو قتل کیا گیا جبکہ پانچ افراد نے آ کر معافی مانگ لی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں معاف کر دیا۔ معافی پانے والوں میں آپ کی بڑی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا قاتل بھی شامل تھا۔ آپ کے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی اور قتل کا پلان کرنے والی ہند بنت عتبہ (جو ابوسفیان کی بیگم تھی) کو بھی معاف کر دیا اور یہ سب بعد میں مخلص مسلمان ثابت ہوئے۔ رضی اللہ عنہم۔

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی، خالد بن ولید، عمرو بن عاص اور سعد رضی اللہ عنہم کی سرکردگی میں مہمات مکہ کے گرد و نواح میں بھیجیں جنہوں نے سب سے بڑے بت منات اور عزی کے آستانوں کا خاتمہ کر دیا۔ ان میں چھپی عورتیں نکلیں جو دیوی بن کر لوگوں کو گمراہ کرتی تھیں، چنانچہ انہیں قتل کر دیا گیا۔

جنگ حنین(8H/630CE)

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت طائف کے قبائل نے ایک لشکر تیار کر لیا تھا اور وہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ اب مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان حنین کے مقام پر جنگ ہوئی۔ اب مسلم فوج کی تعداد 12,000 تھی جس میں مکہ مکرمہ کے نو مسلم بھی شامل تھے۔ شروع میں دشمن کی تیر اندازی سے گھبرا کر مسلم افواج میں بھگدڑ مچی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت قدم رہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اونٹ کی رسی کو ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے پکڑا ہوا تھا اور ایک تیر سے ان کی آنکھ شہید ہو چکی تھی لیکن وہ بھی ثابت قدم رہے اور جہاد کرتے رہے۔

کچھ منٹس کے اندر ہی مسلم افواج نے دوبارہ منظم ہو کر فتح حاصل کی۔ اس جنگ میں دشمن کے 6000 قیدی ہاتھ آئے۔ جنگ کے خاتمے پر بنو ہوازن ایمان لے آئے اور ان قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کی جانب پیش قدمی فرمائی اور شہر کا محاصرہ کر لیا مگر اس محاصرے میں یہ شہر فتح نہ ہو سکا لیکن وہ بعد میں فتح ہو گیا۔

غزوہ تبوک(9H/631CE)

فتح مکہ کے بعد پانچ مہمات مختلف قبائل کی طرف بھیجی گئیں جن میں سے ایک قبیلہ بنو تمیم کی طرف تھی۔ اس قبیلے کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس دوران حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قیصر روم اور غسانی بادشاہ مل کر مسلمانوں کے خلاف ایک لشکر تیار کر رہے ہیں۔ 9H/631CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 30,000 کی ایک زبردست فوج تیار کی اور شمال کی جانب پیش قدمی کی۔ اس کا موضوع سورۃ التوبہ میں ہے اور اس میں اعلان کر دیا کہ جو شخص اس فوج میں شامل نہ ہوا تو وہ کنفرم منافق ہو گا۔

اس غزوے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑھ چڑھ کر ایثار کا مظاہرہ کیا۔ اس میں عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے گھر کا آدھا سامان حاضر کیا اور انہیں امید تھی کہ نیکی میں وہ نمبر ون بن جائیں گے لیکن وہاں معلوم ہوا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا سارا سامان لے آئے تھے۔ اس میں عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ واقعی میں کسی طرح ابو بکر سے مقابلہ نہیں کر سکتا ہوں۔

تبوک کے مقام پر آپ جا کر ٹھہرے اور دشمن مقابلے میں نہ آیا۔ اس مہم کا فائدہ یہ ہوا کہ شمالی عرب میں مسلم ریاست مستحکم ہو گئی۔ سرحدی قبائل نے اطاعت قبول کی اور قیصر روم کی بجائے مسلمانوں کے اتحادی بن گئے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشن مکمل ہو گیا اور اردن بھی آپ کی حکومت میں آ گیا۔

عام الوفود اور طویل دعوت دین(9H/631CE)

فتح مکہ کے بعد پورے عرب کی نفسیات بدل گئی۔ انہوں نے یہ جان لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے رسول ہیں کیونکہ آپ

کی ہر پیش گوئی پوری ہوئی تھی۔ اب قبائل کے وفود جوق در جوق مدینہ منورہ آنے لگے اور اسلام قبول کر کے اپنے قبائل میں واپس جانے لگے۔ 9H/631CE کا نام ہی "عام الوفود" یعنی وفود کا سال مشہور ہو گیا۔ سیرت نگاروں کا اندازہ ہے کہ ان وفود کی تعداد 70 کے قریب تھی۔ ان میں سب سے نمایاں وفد قبیلہ بنو ثقیف کا تھا جو کہ طائف کے باشندے تھے چنانچہ طائف بغیر کسی جنگ کے فتح ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک دستہ طائف بھیجا جس نے لات کے آستانے کو تباہ کر دیا۔ یمن کے مقامی حکمرانوں نے بھی وفد بھیجا اور اسلام میں داخل ہو گئے۔ ایک اور قابل ذکر وفد نجران کا تھا جو کہ ایک عیسائی اکثریتی شہر تھا۔ انہوں نے بھی اطاعت قبول کر لی تو ابو سفیان رضی اللہ عنہ کو اس شہر کا گورنر مقرر کر لیا۔

اس سے پہلے افریقہ میں نجاشی بادشاہ ایمان لائے تھے اور وہاں مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دعوت جاری تھی۔ جب نجاشی بادشاہ کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں نماز جنازہ ادا کی تھی۔ اب دعوت تیزی سے پھیلتی رہی اور نجاشی ممالک جیسے اریٹیریا، سوڈان، ایتھوپیا اور صومالیا تک دعوت آسانی سے پہنچ گئی۔

سورۃ التوبہ۔۔۔ مشرکین کی فائنل سزا کا اعلان (9H/631CE)

ذی الحجہ 9H/631CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ اس موقع پر سورۃ توبہ کی ابتدائی آیات کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پڑھ کر حج کے اجتماع میں سنایا۔ سورۃ التوبہ قرآن مجید کی صرف ایک سورۃ ہے جس کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی کیونکہ یہاں اہل عرب کے لیے سزا موت کا آغاز ہے۔

بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ.(1) فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ.(2) وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ وَرَسُولُهُ ۚ فَإِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۖ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ.(3)

اللہ تعالی اور اُس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکین کے لیے اعلان براءت (بری الذمہ) ہے جن سے (اے رسول!) آپ مشرکین سے معاہدے کر لیے تھے۔ (اے مشرکین عرب!) چنانچہ اب ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ تعالی کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ تعالی (اپنے رسول کا) انکار کرنے والوں کو رسوا کر کے رہے گا۔

(پھر حج کا موقع آ جائے تو اِس سرزمین کے) سب لوگوں تک پہنچانے کے لیے بڑے حج کے دن (9H/631CE) اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے اعلان عام بھی کر دیا جائے کہ اللہ اور اُس کا رسول بھی مشرکین سے بری الذمہ ہیں۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ تم اللہ تعالی سے بھاگ نہیں سکتے۔ (اے رسول!) ان منکرین کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ. (4) فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ. (5)

وہ مشرکین، البتہ اِس اعلان براءت سے مستثنیٰ ہیں جن سے (اے رسول!) آپ نے معاہدہ کر لیا تھا۔ پھر اسے پورا کرنے میں انہوں نے آپ کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ آپ کے خلاف کسی کی مدد کی ہے۔ چنانچہ ان کا معاہدہ ان سے معاہدے کے ٹائم تک پورا کر لیجیے کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بد عہدی سے بچنے والے ہوں۔ (بڑے حج کے دن) اِس (اعلان) کے بعد جب حرام مہینے (ذوالقعدہ، ذوالحج اور محرم) گزر جائیں تو **اِن مشرکوں کو جہاں پائیں، قتل کر دیجیے گا** اور اِس مقصد کے لیے انہیں پکڑیں، گھیریں اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھیے گا۔ **پھر اگر یہ توبہ کر لیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اِن کی راہ چھوڑ دیجیے گا**۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے کیونکہ اس کی شفقت ہمیشہ کے لیے ہے۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ. (6) كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ. (7) كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ. (8)

اگر (اِس پولیس ایکشن (Action) کے موقع پر) اِن مشرکوں میں سے کوئی شخص آپ سے امان چاہے (کہ وہ آپ کی دعوت سننا چاہتا ہے) تو اسے امان دے دیجیے گا۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے علاقے تک پہنچا دیجیے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو (اللہ تعالیٰ کی باتوں کو زیادہ) نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے ہاں اِن مشرکوں سے کوئی عہد کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟ ہاں جن لوگوں سے آپ نے مسجد الحرام کے پاس (حدیبیہ میں) معاہدہ کیا تھا، چنانچہ جب تک وہ آپ کے ساتھ سیدھے رہیں، آپ بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہیے گا، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بد عہدی سے بچنے والے ہوں۔

کس طرح باقی رہ سکتا ہے، جب کہ حال یہ ہے کہ اگر وہ آپ پر کہیں غلبہ پالیں تو نہ آپ کے بارے میں کسی رشتہ داری کا لحاظ کریں گے، نہ کسی معاہدے کا؟ اپنے منہ کی باتوں سے وہ آپ کو راضی کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور اُن میں سے اکثر بد عہد ہیں۔

اشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِهِ ۚ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ. (9) لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ. (10) فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ. (11) وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ. (12)

اللہ تعالی کی آیات کے عوض میں انہوں نے تھوڑی قیمت قبول کر لی تھی، پھر اس کی راہ سے رک گئے ہیں۔ یقیناً بہت برا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ کسی مسلمان کے معاملے میں نہ انہیں کسی رشتے داری کا لحاظ ہے، نہ معاہدے کا اور وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ چنانچہ **اگر وہ لوگ توبہ کر لیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو آپ کے دینی بھائی بن جائیں گے۔** ہم اُن لوگوں کے لیے اپنی آیات کی تفصیل کیے جا رہے ہیں جو جاننا چاہتے ہوں۔ اس معاہدے کے بعد بھی جو انہوں نے سائن کیا تھا تو اگر وہ اپنے معاہدے کو توڑ ڈالیں گے اور آپ کے دین میں عیب لگائیں گے تو کفر کے اِن لیڈرز سے بھی جنگ کر لیجیے گا۔ ان کے قول و قرار کچھ نہیں، (یہ آج نہیں تو کل اپنا معاہدہ توڑ دیں گے، لہٰذا جنگ کیجیے گا) تاکہ یہ (اِس کفر و شرک سے) باز آ جائیں۔ (سورۃ التوبہ 9)

ان آیات کی رو سے مشرکین عرب کے لیے دو آپشنز رکھی گئیں: یا تو وہ ایمان لے آئیں؛ یا پھر موت کی سزا کے لیے تیار ہو جائیں۔ جن عرب قبائل کے ساتھ غیر متعین مدت کے معاہدے تھے، انہیں ختم کر دیا گیا اور جن کے ساتھ متعین مدت کے معاہدے تھے، انہیں بتا دیا گیا کہ معاہدے کی تجدید نہیں ہو گی۔ مشرکین کو خانہ کعبہ کے پاس آنے سے روک دیا گیا۔ مشرکین عرب کے لیے یہ بالکل ویسی ہی سزا تھی جیسا کہ قوم نوح، عاد، ثمود، اور فرعون کو دی جا چکی تھی۔ اس اقدام کی تفصیل ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔ اس کے بعد سبھی مشرکین عرب نے اسلام قبول کر لیا۔

سورۃ التوبہ میں آگے منافقین کی طرف فائنل وارننگ کر دی کہ جو بھی غزوۃ تبوک میں نہیں آئے تو وہ کنفرم منافق ہیں۔ اس طرح منافقین کلیئر ہو گئے اور پھر ان کی اکثریت نے خلوص اختیار کر لیا۔

حج الوداع (10H/632CE)

ذی الحجہ 10H/632CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج ادا فرمایا اور اس میں سوا لاکھ کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کی۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جس میں مستقبل کی پالیسی کے خطوط واضح فرما دیے۔ اس کا مطالعہ بھی ہم اگلے ابواب میں کریں گے۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

آج کے دن میں نے آپ لوگوں کے لیے آپ کے دین کو مکمل کر دیا اور آپ پر اپنی نعمت کو مکمل کر دیا اور اسلام کو آپ کے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ (المائدہ 5:3)

حجۃ الوداع کے خطبے کے کچھ ارشادات ہمارے سامنے مشہور ہیں۔ اس کا ترجمہ حاضر ہے:

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہم اسی کی حمد کرتے ہیں۔ اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ اس سے معافی مانگتے ہیں۔ اسی کے پاس توبہ کرتے ہیں اور ہم اللہ ہی کے ہاں اپنی شخصیت کی برائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے تو پھر کوئی اسے بھٹکا نہیں سکتا اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی راہ ہدایت نہیں دکھا سکتا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور وہ ایک ہی ہے۔ اس کا

کوئی شریک نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔

اللہ کے بندو! میں آپ کو اللہ تعالی سے خبر دار رہنے کی تاکید اور اس کی اطاعت پر ماٹیویٹ کرتا ہوں اور میں اسی سے ابتدا کرتا ہوں جو بھلائی ہے۔ لوگو! میری گفتگو سن لیجیے کہ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں آپ سے اس قیام گاہ میں اس سال کے بعد پھر کبھی ملاقات کر سکوں گا۔ ہاں جاہلیت کے تمام دستور آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں؛ عربی کو عجمی (نان عرب) پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی بڑی حیثیت نہیں لیکن تقویٰ کے سبب سے۔

اللہ تعالی سے ڈرنے والا انسان مومن ہوتا ہے اور اس کا نافرمان شقی۔ آپ سب کے سب آدم کی اولاد میں سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ لوگو! آپ کے خون، آپ کے مال اور آپ کی عزتیں ایک دوسرے پر ایسی حرام ہیں جیسا کہ آج کے دن کے اس شہر کی اور اس مہینہ کی حرمت کرتے ہیں۔ دیکھیے عنقریب آپ سب نے اللہ تعالی کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ آپ سے آپ کے اعمال کے بارے میں سوال فرمائے گا۔ خبر دار رہیے اور میرے بعد گمراہ نہ بن جایئے گا کہ ایک دوسرے کی گردنیں آپس میں کاٹتے پھریں۔

جاہلیت کے قتل کے تمام جھگڑے میں ملیامیٹ کرتا ہوں۔ پہلا خون جو باطل کیا جاتا ہے بالخصوص (میرے کزن) ربیعہ بن حارث عبد المطلب کے بیٹے کا ہے۔ اگر کسی کے پاس امانت ہو تو وہ اسے اس کے مالک کو ادا کر دے اور اگر سود ہو تو وہ ختم کر دیا گیا ہے۔ ہاں آپ کا سرمایہ مل جائے گا۔ نہ آپ ظلم کریں اور نہ ہی آپ پر ظلم کیا جائے۔ اللہ تعالی نے فیصلہ فرمادیا ہے کہ سود ختم کر دیا گیا اور سب سے پہلے میں (اپنے چچا) عباس بن عبد المطلب کا سود ختم کر رہا ہوں۔

لوگو! آپ اس سرزمین میں شیطان اپنی پوجا جانے سے مایوس ہو گیا ہے لیکن دیگر چھوٹے گناہوں میں اپنی اطاعت کیے جانے پر خوش ہے اس لیے اپنا دین اس سے محفوظ رکھیے گا۔ اللہ کی کتاب میں مہینوں کی تعداد اسی دن سے 12 ہیں، جب اللہ تعالی نے زمین و آسمان پیدا کیے تھے۔ ان میں سے چار حرمت مہینے ہیں۔ تین (ذیقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) لگاتار ہیں اور رجب تنہا ہے (اس لیے اس مہینوں میں جنگ حرام ہے۔)

لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ تعالی سے ڈرتے رہیے۔ اللہ تعالی کے نام کی ذمہ داری سے آپ نے انہیں بیوی بنایا اور خدا کے کلام سے آپ نے ان کا جسم اپنے لیے حلال قائم کیا ہے۔ آپ کا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ آپ کے بستر پر کسی غیر کو نہ آنے دیں۔ لیکن اگر وہ ایسی حرکت کریں تو انہیں ہلکی سزا دیں جس کی نشانی نمودار نہ ہو۔ خواتین کا حق آپ پر یہ ہے کہ آپ انہیں اچھی طرح کھانا کھلائیں اور، اچھی طرح لباس پہنادیں۔

آپ کے غلام آپ کے پاس ہیں۔ جو خود آپ کھانا کھائیں تو انہیں بھی وہی کھلائیں اور جو لباس پہنچیں تو وہ بھی انہیں پہنا دیں۔ اللہ تعالی نے وراثت میں ہر حقدار کو اس کا حق دیا ہے۔ اب کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ لڑکا اس کا وارث جس کے بستر پر پیدا ہو، بدکار کے لیے پتھر اور ان کے حساب خدا کے ذمہ ہے۔

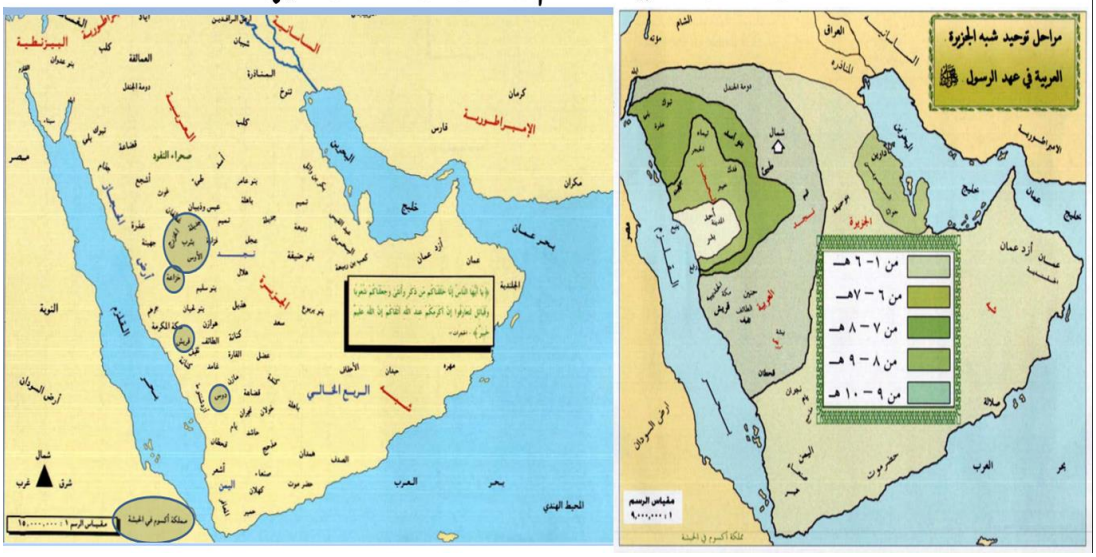
خاتون کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر لینا جائز نہیں۔ قرض ادا کیا جائے، رکھا ہوا سامان واپس کی جائے، عطیہ لوٹا دیا جائے۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔

مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے۔ باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور بیٹے کے جرم کا باپ ذمہ دار نہیں۔ اگر کٹی ہوئی ناک کا کوئی افریقی بھی آپ کا ذمہ دار ہو اور وہ آپ کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کیجیے گا۔

لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی جدید امت پیدا ہو سکے گی۔ خوب سن لیجیے کہ اپنے رب کی عبادت کریں اور پانچ نماز ادا کریں۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھیں اور کعبہ کا حج ادا کریں۔ میں آپ میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر آپ نے اسے مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوں گے تو پھر وہ کیا چیز ہے؟ کتاب اللہ (قرآن) اور سنت رسول اللہ۔ (مسند الدارمی، مؤلف: أبو محمد عبد اللہ الدارمی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت ہر سال میں کیسے پھیلتی رہی تو آپ ان کے نقشے میں دیکھ سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں دعوت کی کامیابی



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیگر ممالک کے بادشاہوں کی دعوت اور آخری خطوط میں الٹی میٹم



رخصتی (11H/632CE)

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشن مکمل ہو چکا تھا اور دین مکمل ہو چکا تھا۔ پورا جزیرہ نما عرب اسلام کے زیر نگیں آ چکا تھا اور

اب اس مشن کے انٹرنیشنل فیز کا آغاز ہونا تھا مگر اس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کردہ صحابہ کرام کافی تھے۔ اس مشن کی تفصیلات ہم اگلے ابواب میں بیان کریں گے۔ اپنے آخری ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مہم تیار کر کے حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں شام کی طرف بھجوائی۔ ابھی یہ لوگ مدینہ منورہ کے قریب ہی تھے کہ حجۃ الوداع کے تین ماہ بعد ربیع الاول 11H/632CE میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات واقع ہو گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ لوگوں نے ایمان کا انکار کیا اور نئے جعلی نبیوں نے دعوی کیا۔ اس پر سورۃ التوبہ کے انہی احکامات کو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر بھیجے اور ان کا قتل عام ہو گیا تھا لیکن جو لوگ توبہ کر سکے تو وہ ایمان لائے اور ان پر امن قائم رہا۔

عہد نبوی کو ہم اس ٹائم لائن کی صورت میں بیان کر رہے ہیں جسے آپ ذہن نشین کر سکتے ہیں تاکہ آپ قرآن، حدیث، سیرت نبوی، واقعات اور دیگر دینی علوم کو سمجھنے میں یہ ٹائم لائن بہت مدد دے گی۔

سال	واقعہ
571	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت
571-575	سیدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں قیام
577	سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا کی وفات
579	جناب عبد المطلب کی وفات
583	رسول اللہ کا پہلا سفر شام
585-586	حرب فجار اور حلف الفضول
583-609	متعدد تجارتی سفر
596	سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی
605	خانہ کعبہ کی تعمیر نو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حجر اسود کا قبائلی جھگڑا نمٹانا
609	اعلان نبوت
609-612	محدود لوگوں کو دعوت کا دور
612	بڑے پیمانے پر دعوت کا آغاز
612-614	صحابہ پر مظالم کا آغاز

سال	واقعہ
614	پہلی ہجرت حبشہ
616-619	بنو ہاشم کی شعب ابی طالب میں محصوری
616	دوسری ہجرت حبشہ
619	عام الحزن۔ جناب ابو طالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات
619	سفر طائف اور مشکلات کا کلائمیکس
619	سفر معراج
620	انصار کے ابتدائی لوگوں کا قبول اسلام
621	انصار کے مزید لوگوں کا قبول اسلام اور پہلی بیعت عقبہ
621	مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی مدینہ میں دعوتی تحریک
1H/622CE	دوسری بیعت عقبہ اور ہجرت نبوی
2H/624CE	جنگ بدر
3/625	جنگ احد
5/627	جنگ خندق
6/628	صلح حدیبیہ
7/629	جنگ خیبر
8/630	فتح مکہ
9/631	غزوہ تبوک
9/631	عرب قبائل کے وفود کی مدینہ آمد اور قبول اسلام
9-10/631-632	مشرکین عرب کے لیے سزائے عام
10/632	حجۃ الوداع
11H/632CE	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

سیکشن B: علمی و فکری تاریخ

باب 4: علم و دانش

دعوت دین کے عمل کا ایک لازمی حصہ نظام تعلیم و تربیت ہے۔ جب کسی شخص کو اسلام کی دعوت دی جائے اور وہ اسے قبول کر لے تو اگلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام پر ثابت قدم رہنے میں اس کی مدد کی جائے۔ اسے دین سکھایا جائے اور اس پر عمل کی اسے تربیت دی جائے۔ اس کی شخصیت کی تعمیر (Character Building) اسلامی اصولوں پر کی جائے اور اس کا تزکیہ نفس کیا جائے۔

اس باب میں ہم عہد نبوی کے نظام تعلیم و تربیت سے مطالعہ کا آغاز کریں گے جو کہ دعوت دین کا نتیجہ اور علم و فکر کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد ہم اس دور کی علمی و فکری تاریخ کا مطالعہ کریں گے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تعلیم و تربیت کے طریق کار کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ آپ نے کس طرح اپنے صحابہ کو تعلیم دی۔ اس کے بعد اس میدان میں صحابہ کرام کے کردار کا مطالعہ کریں گے۔ واضح رہے کہ یہاں تعلیم و تربیت سے ہماری مراد دینی تعلیم و تربیت ہے۔ دنیاوی علوم و فنون کا جو ذکر آئے گا، وہ ضمنی ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات معلوم و معروف ہے کہ آپ اعلان نبوت سے پہلے کسی علمی و فکری اور تعلیمی سرگرمی میں شامل نہیں رہے۔ اپنے چچا کے ساتھ مل کر آپ نے تجارت سیکھی اور اس کے بعد عمر کا بڑا حصہ اسی میں گزار دیا۔ اخلاق و کردار کے اعتبار سے آپ اس درجے کے حامل تھے کہ آپ اپنے معاشرے میں صادق (سچا) اور امین (صاحب امانت و دیانت) کے لقب سے مشہور تھے۔ 35 برس کی عمر کے بعد البتہ اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کی جانب زیادہ مائل ہوئے اور تنہائی میں وقت گزارنے لگے۔ آپ کی تمام تر تعلیم و تربیت اللہ تعالی نے بذریعہ وحی فرمائی۔ اسے ہم متعدد عنوانات کے تحت بیان کریں گے۔

وحی کے تحمل کی تیاری

انسان ایک مادی اور روحانی وجود ہے اور اس کی مادیت کے سبب اس کے لیے یہ ایک مشکل کام ہے کہ یہ براہ راست اللہ تعالی سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ انبیا اور رسل کو خاص طور پر اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ. وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ

مُسْتَقِيمٍ. صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ أَلَا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ.

کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ یہ بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے، یا پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی قاصد بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔ وہ برتر اور صاحب دانش ہے۔ اسی طرح (اے نبی!) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے۔ آپ کو علم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں، راہ دکھاتے ہیں۔ یقیناً آپ سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں، اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہیے! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ (الشوری 42:51-53)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے تین طریقے ہیں: دل میں بات ڈالنا، پردے کے پیچھے سے آواز آنا جیسا کہ حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام سے ہوا، اور کسی فرشتے کے ذریعے پیغام بھیجنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی انہی طریقوں سے آتی تھی۔ آپ خود فرماتے ہیں:

مجھ پر وحی گھنٹی بجنے کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ مجھ پر سخت ترین ہوتی ہے۔ جب میں کہی گئی بات کو یاد کر لیتا ہوں تو یہ حالت ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی فرشتہ انسانی صورت میں میرے پاس آتا ہے اور کلام کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے، میں یاد کر لیتا ہوں۔[3]

اسی حدیث میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ سخت سردی کے دنوں میں بھی جب وحی آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسینے سے شرابور ہو جاتے۔ چونکہ وحی کو برداشت کرنا ایک مشکل نفسیاتی عمل ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا گیا۔

وحی کی سب سے آسان صورت یہ تھی کہ فرشتہ انسانی صورت میں آئے چنانچہ آغاز اسی سے کیا گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تھے تو حضرت جبریل علیہ الصلوۃ والسلام آئے اور آپ سے عرض کیا: ''پڑھیے۔'' آپ نے فرمایا: ''میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں۔'' انہوں نے آپ کو پکڑ کر زور سے دبایا۔ پھر عرض کیا: ''پڑھیے۔'' آپ نے وہی جواب دیا۔ تین مرتبہ یہی عمل ہوا تو آپ کی زبان رواں ہو گئی اور آپ سورۃ العلق کی ابتدائی آیات پڑھنے لگے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر آئے اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ مجھے چادر اوڑھا دیجیے۔ پھر سیدہ اور ان کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ، جو اس وقت عیسائی تھے، سے گفتگو کے بعد آپ کو اطمینان ہوا۔[4] اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے وحی کا سلسلہ موقوف ہو گیا اور رسول اللہ کو اس کا اشتیاق رہنے لگا۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ دوبارہ جاری ہوا۔ پھر تو یہ عالم ہو گیا کہ جب وحی کا سلسلہ زیادہ ہوتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف و نشاط کی کیفیت میں رہتے اور صدقہ و خیرات زیادہ کر دیا کرتے تھے۔[5]

نفسیاتی تسکین

دین کی دعوت چونکہ ایک مشکل کام تھا اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، اس وجہ سے اللہ

تعالی نے آپ کی نفسیاتی تسکین کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا۔ قرآن مجید میں ہمیں جگہ جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی ملتی ہے۔ جب بھی آپ پر مشکلات آتیں، آپ کو بذریعہ وحی سابق انبیا کی دعوت و عزیمت کی جدوجہد کی داستانیں سنائی جاتیں، جس سے آپ کے دل کو تسکین ملتی۔

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ.

اگر یہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں (تو پروانہ کیجیے کہ) آپ سے پہلے رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے حالانکہ وہ روشن دلائل، صحائف اور روشن کتاب کے ساتھ آئے تھے۔ (آل عمران 3:184)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کفار کے رویے کا شدید دکھ پہنچا تو آپ کی تسکین اللہ تعالی نے اس طرح فرمائی:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ. إِنْ نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ. وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ.

(اے نبی!) شاید آپ اس غم میں اپنی جان دے دیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ہم اگر چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں (مگر ایسا کرنا ہماری اسکیم کا حصہ نہیں ہے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ) ان لوگوں کے پاس رحمان کی طرف سے جو نئی نصیحت بھی آتی ہے، یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ (الشعرا 26:3-5)

سورۃ الضحی اور سورۃ الانشراح کا موضوع ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفسیاتی تسکین ہے:

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ. وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ. الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ. وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ. فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا. إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا. فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ. وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ.

کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟ اور آپ سے وہ بوجھ اتار نہیں دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی؟ اور آپ کے لیے آپ کا ذکر بلند نہیں کر دیا؟ (ان سب انعامات کو مد نظر رکھتے ہوئے یاد رکھیے کہ) یقیناً تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے، (جی ہاں!) تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے۔ تو جب آپ اپنے کاموں سے فارغ ہو جائیں تو (عبادت کے لیے) کمر باندھ لیجیے اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جائیے۔ (الانشراح)

سفر معراج کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ پیغمبر نے پورے یقین کے ساتھ دیگر انسانوں کو اللہ تعالی کا پیغام پہنچانا ہوتا ہے، اس لیے انہیں بعض اوقات غیبی امور کا براہ راست مشاہدہ کروا دیا جاتا ہے تاکہ وہ پورے یقین کے ساتھ آنکھوں دیکھا حال دوسروں کو سنا دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے بیت المقدس کا سفر کروایا اور پھر وہاں سے آسمانوں میں مختلف عجائب قدرت کا مظاہرہ کروایا۔ سابقہ انبیا کرام علیہم الصلوۃ والسلام سے ملاقات کروائی اور سب سے بڑھ کر آپ کو خود سے ہم کلام ہونے کا شرف عطا کیا۔

یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت شدید مشکلات کا شکار تھی اور اہل مکہ کے علاوہ اہل طائف بھی آپ کے دشمن ہو چکے تھے۔ آپ کے اپنے قبیلے بنو ہاشم نے ابو لہب کی قیادت میں آپ کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیا تھا اور آپ کے قریبی حمایتی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور جناب ابو طالب وفات پا چکے تھے۔ ہم اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں کہ ان براہ راست مشاہدات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر تسکین حاصل ہوئی ہو گی اور کس درجے میں آپ ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ دعوتی میدان میں سرگرم عمل ہوئے ہوں گے۔

ایمانیات، اس کے دلائل اور دینی احکام کی تعلیم

قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمانیات اور اس کے دلائل کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔ بالخصوص مکی زندگی میں نازل ہونے والی کوئی بھی سورت دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے دلائل سکھائے جا رہے ہیں جن سے آپ مشرکین اور اہل کتاب کو اپنی رسالت کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے جواب دے سکتے ہیں۔ مدنی سورتوں میں زیادہ توجہ دینی احکام سے متعلق سوالات پر دی گئی ہے۔

بدلتے ہوئے حالات میں رہنمائی

بدلتے ہوئے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی کی طرف سے راہنمائی ملتی تھی۔ اس کا بڑا حصہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ جنگ بدر کے بعد کے حالات پر تبصرہ ہو یا جنگ احد کے، غزوہ احزاب ہو یا غزوہ تبوک، منافقین کے معاملات ہوں یا مشرکین کے، یہود سے مذاکرات کرنا ہوں یا نصاری سے، غرض ایک ایک معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رہنمائی اللہ تعالی کی طرف سے دی گئی۔

تنبیہ و تادیب

تعلیم و تربیت کا ایک اہم حصہ تنبیہ و تادیب بھی ہوتا ہے۔ جب ایک شاگرد کوئی غلطی کرتا ہے تو استاذ اس کی توجہ اس جانب دلاتا ہے اور اس کی اصلاح کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا اگرچہ گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں لیکن دعوت دین میں ان کے جوش اور جذبے کے سبب کبھی کوئی ایسا معاملہ ہو جاتا ہے جس میں اللہ تعالی ان کی خصوصی راہنمائی فرما دیتے ہیں۔ ایسے ہی چند مواقع کا ذکر ہمیں قرآن میں ملتا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو آپ اسے یاد کرنے کے لیے تیزی سے دوہراتے۔ اللہ تعالی نے آپ کو تنبیہ فرمائی کہ آپ کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ. إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ. فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ. ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ.

آپ (وحی کو یاد کرنے کے لیے) جلدی جلدی اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے۔ اسے جمع کروانا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ لہذا جب ہم اسے پڑھ

رہے ہوں تو اس وقت آپ اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہیے۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔(القیامۃ75:16-19)

ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے کچھ سرداروں کے سامنے دعوت پیش کر رہے تھے اور اس موقع پر نابینا صحابی حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آ گئے اور کچھ باتیں پوچھیں۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دعوت کا اثر زائل ہوتا محسوس ہوا کیونکہ یہ سردار اپنے معاملے میں ڈسٹربنس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور پر کبیدگی کے آثار نمایاں ہوئے تو اللہ تعالی نے اس معاملے میں بھی آپ کو تنبیہ فرمادی:

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى. أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمٰى. وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰٓى. أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى. أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى. فَأَنْتَ لَهُ تَصَدّٰى. وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰى. وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعٰى. وَهُوَ يَخْشٰى. فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى.

انہوں نے تیوری چڑھائی اور بے رخی برتی۔ اس بات پر کہ ایک نابینا ان کے پاس آئے۔ آپ کو کیا علم تھا کہ شاید وہ اپنی اصلاح کر لیتے یا نصیحت سنتے تو نصیحت انہیں فائدہ پہنچاتی۔ جو بے پرواہی برتتا ہے، اس کے تو آپ پیچھے پڑتے ہیں حالانکہ اگر وہ اصلاح نہ کرے تو آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اور جو آپ کے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے، تو آپ سے بے پرواہی برت رہے ہیں۔(عبس80:1-10)

بعض لوگ یہاں کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان آیات میں عتاب کیا گیا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ یہاں اگرچہ اللہ تعالی کا لہجہ سخت ہے لیکن اس شدت کا رخ اصل میں ان کفار کی جانب ہے جو بے پرواہی برت رہے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ جو لوگ آپ کی بات شوق سے سن کر اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، وہ آپ کی توجہ اور عنایت کے زیادہ مستحق ہیں۔

صحابہ کرام کی تعلیم وتربیت

اللہ تعالی سے تربیت پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کی تربیت کا اہتمام فرمایا اور اس درجے کا گروہ تیار کیا کہ اس نے دنیا کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔ اس تربیت کی تفصیل احادیث نبوی میں بیان ہوئی ہے جن کی تعداد 50,000 کے قریب ہے۔ اگرچہ ان احادیث میں کوئی نہ کوئی خاص واقعہ بیان ہوتا ہے لیکن ان سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا اسلوب کیا تھا۔

تعلیم وتربیت کا طریقہ کار

اس تربیت کا نصاب قرآن مجید تھا جس میں نہ صرف رسول اللہ، بلکہ آپ کے صحابہ کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفس کا پورا پروگرام تھا۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرتے، انہیں قرآن سنانے اور سمجھانے کا سلسلہ شروع ہوتا۔ قرآن مجید کو بغیر سوچے سمجھے پڑھنے کا کوئی تصور ان کے ہاں موجود نہ تھا کہ یہ ان کی اپنی مادری زبان میں نازل ہو رہا تھا۔

تعلیم وتربیت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو طرح کے طریقے اختیار فرمائے: رسمی تعلیم (Formal Education) اور غیر رسمی تعلیم (Informal Education)۔ آپ قرآن پڑھانے کی باقاعدہ مجالس منعقد کرتے جن میں آپ قرآن کی تلاوت فرماتے اور صحابہ کرام سنتے۔ جب بھی کوئی سورت نازل ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پڑھ کر سناتے۔ بعض صحابہ اس سورت کو یاد کر لیتے اور بعض اپنی سہولت کے لیے لکھ لیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ مکی زندگی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر یہی سورتیں نماز میں پڑھی جاتیں تو صحابہ ان کے معانی اور مطالب پر غور کرتے، ان کی روشنی میں اپنا احتساب کرتے اور ان سے اپنے لیے راہ عمل تلاش کرتے۔ قدرتی طور پر یہ محافل نمازوں کے ساتھ منعقد کی جاتی تھیں۔ طلوع آفتاب سے ظہر تک صحابہ اپنے دنیاوی کاموں میں مشغول رہتے اور اس کے بعد ہر نماز کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اگر کوئی صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں کسی وجہ سے نہ آسکتے تو اپنے کسی ساتھی سے اس کی روداد سن لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابتدا میں مسجد نبوی سے کافی دور رہتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے انصاری بھائی سے یہ طے کیا کہ دونوں ایک ایک دن مسجد نبوی جایا کریں گے اور واپس آکر رسول اللہ کی احادیث ایک دوسرے کو سنائیں گے۔

اس تعلیم میں نہ صرف مرد بلکہ خواتین بھی شریک ہوتیں۔ ان کی صفیں الگ ہوتیں لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باقاعدہ تعلیم حاصل کیا کرتی تھیں۔ جب خواتین نے محسوس کیا کہ مردوں کے سوالات کے سبب ان کے لیے وقت نہیں بچتا تو ان کی فرمائش پر ایک دن رسول اللہ نے ان کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا تھا۔[6] خواتین کے ہاں اگر آپ کوئی خاص مسئلہ دیکھتے تو اس کی جانب توجہ دیتے۔ جیسے ایک موقع پر آپ نے خواتین کو خاص طور پر شوہروں کی ناشکری کرنے پر تنبیہ فرمائی کہ یہ کتنی غلط بات ہے کہ شوہر سے ایک غلطی سرزد ہو تو اسے کہہ دیا جائے کہ اس گھر میں میں نے کبھی سکھ دیکھا ہی نہیں۔[7] بعض اوقات خواتین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آکر بھی مسائل پوچھ لیا کرتی تھیں۔ ان کے خصوصی مسائل جیسے حیض ونفاس، شوہر سے تعلق وغیرہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو تربیت دی تھی اور وہ انہیں جواب دیا کرتی تھیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان موضوعات پر ان سے بات کرتے ہوئے حیا محسوس کرتے تھے۔[8]

قرآن مجید کی رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر رسمی تعلیم (Informal Education) کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ آپ انہیں دین کے عملی احکام جیسے نماز کو آپ عملاً سکھاتے۔ صحابہ کے سوالات کے جواب دیتے۔ کسی صحابی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو ان کی راہنمائی فرماتے۔ کسی میں اگر کوئی قابل اصلاح چیز دیکھتے تو انہیں اس جانب توجہ دلا دیتے۔ یہ سلسلہ نہ صرف نمازوں کے ساتھ بلکہ تقریباً ہر وقت ہی جاری رہتا۔ دن ہو یا رات، سفر ہو یا حضر، انفرادی ملاقات ہو یا کوئی مجلس، ہر حالت میں صحابہ کرام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نہ کچھ سیکھ رہے ہوتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ دوران سفر اگر کوئی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹ پر سوار ہوتے تو انہیں بھی کوئی نہ کوئی بات آپ تلقین فرما دیتے۔

تعلیم وتربیت میں بالخصوص جمعہ کے خطبے کی بہت زیادہ اہمیت تھی کیونکہ اس دن مدینہ کے گرد ونواح کے لوگ بھی شریک ہوا کرتے

تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب کے فصیح ترین خطیب تھے اور آپ کی خطابت سے لوگ بہت متاثر ہوا کرتے تھے۔ اس میں آپ دین کے اہم احکام کے ساتھ ساتھ صحابہ کا تزکیہ نفس کیا کرتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں تعلیم وتربیت

مکی اور مدنی زندگی کے مختلف ادوار میں تعلیم وتربیت مختلف مراحل سے گزری۔ اعلان نبوت کے بعد پہلے تین سال تک تو خاص خاص لوگوں کو اسلام کی دعوت دی گئی اور 40 کے قریب افراد نے اسلام قبول کیا۔ اس دور میں میں جو سورتیں نازل ہوئیں، ان میں بنیادی زور دو پہلوؤں پر تھا: ایمانیات اور اخلاقیات۔ ان سورتوں میں عقیدہ توحید اور آخرت میں اللہ تعالی کے حضور جواب دہی کے تصور کو ذہنوں میں راسخ کیا گیا اور بنیادی اخلاقیات سکھائے گئے۔ اس کی مثال یہ آیات کریمہ ہیں:

لَا أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ. وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ. وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ. لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ. أَيَحْسَبُ أَنْ لَنْ يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ. يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا. أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ. أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ. وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ. وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ. فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ. وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ. فَكُّ رَقَبَةٍ. أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ. يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ. أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ. ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ. أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ. وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ. عَلَيْهِمْ نَارٌ مُؤْصَدَةٌ.

میں اس شہر کو بطور ثبوت پیش کرتا ہوں کہ آپ اس میں موجود ہیں۔ والد (ابراہیم) اور ان کی اولاد (بنی اسماعیل) اس بات کے گواہ ہیں کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا اس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہ پا سکے گا؟ یہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اسے نہیں دیکھا؟ کیا ہم نے اسے آنکھیں، زبان اور ہونٹ عطا نہیں کیے؟ اور کیا اسے ہم نے دونوں نمایاں راستے دکھا نہیں دیے؟ مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہیں کی۔ آپ کو کیا معلوم ہے کہ وہ دشوار گزار گھاٹی ہے کیا؟ کسی گردن کو غلامی سے آزاد کروانا، فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا، (اور یہ کہ) انسان ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلق خدا پر) رحم کی تلقین کی۔ یہی دائیں جانب والے لوگ ہیں۔ اور جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، وہی بائیں جانب والے (بدبخت) لوگ ہیں اور انہیں آگ میں بند کیا جائے گا۔ (البلد 90)

اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو انفرادی تعلیم بھی دیتے تھے اور اجتماعی بھی۔ وہ صحابہ جو آپ سے قرآن کے حصے سمجھ لیتے، پھر دیگر صحابہ کو پڑھانے کی خدمت بھی انجام دیتے۔ جیسا کہ حضرت عمر کے قبول اسلام کے معروف واقعے میں بیان ہوا ہے کہ حضرت خباب، حضرت سعید بن زید اور سیدہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہم کو سورۃ طہ کی تعلیم دے رہے تھے۔ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان کو اس تعلیم وتربیت کا مرکز بنا لیا اور یہ اسلام کا اولین اسکول یا مدرسہ بنا۔ یہاں مسلمان مل جل کر نماز پڑھا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تعلیم وتربیت کیا کرتے تھے۔

مشکلات کا دور شروع ہوا تو قرآن مجید میں صحابہ کرام کی نفسیاتی تسکین کی آیات بھی نازل ہونے لگیں۔ انہیں تسلی دی جانے لگی کہ جو

مشکلات ان پر آ رہی ہیں، وہ ان سے پہلے بھی انبیا کرام کے صحابہ پر آئی ہیں۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ. وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ.

کیا ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ انہیں اس بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ انہوں نے کہا: "ہم ایمان لائے" اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی؟ ان سے پہلے لوگوں کی آزمائش ہم کر چکے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو جو (ایمان کا) سچا دعوی کر رہے ہیں ان سے ممیز ضرور کرے گا جو جھوٹ بول رہے ہیں۔ (العنکبوت 29:2-3)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ پورے مکی دور میں جاری رہا۔ جو صحابہ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے، ان کی کمیونٹی کو منظم کرنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص کر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ اس بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ ہجرت حبشہ کے بعد رابطے کا کیا ذریعہ اختیار کیا گیا لیکن ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کمیونٹی کا تعلق مکہ مکرمہ کی مسلم کمیونٹی سے رہا ہو گا اور قرآن مجید کی جو سورتیں نازل ہوتی ہوں گی، انہیں حبشہ پہنچانے کا اہتمام کیا گیا ہو گا۔ ممکن ہے کہ اس عمل میں مسلم تاجروں نے حصہ لیا ہو گا جو تجارت کی غرض سے حبشہ آتے جاتے رہے ہوں گے۔

ہجرت مدینہ سے پہلے صحابہ کرام کو ذہنی طور پر تیار کیا گیا کہ اب انہیں ایک علاقے پر حکومت دی جا رہی ہے اور انہیں اپنی کمیونٹی کو کس طرح منظم کرنا ہے۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مدینہ جا کر نماز قائم کریں، اپنی دولت میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کریں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام قائم کریں اور اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلائیں۔[9] حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس مقصد کے لیے مدینہ بھیجا کہ وہ وہاں جا کر دعوت و تبلیغ کے ساتھ اسلام قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں۔ ان کے بعد حضرت ابن ام مکتوم، عمار بن یاسر اور بلال رضی اللہ عنہم بھی مدینہ آ گئے اور لوگوں کو تعلیم دینے لگے۔[10]

مدینہ منورہ میں تعلیم و تربیت

ہجرت نبوی کے بعد مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی تو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ یہاں اب دینی احکام میں وسعت آ رہی تھی۔ نہ صرف ایمان اور اخلاق بلکہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج، قربانی، نکاح و طلاق، معیشت، زراعت، تجارت، سیاست غرض ہر شعبہ زندگی کے مسائل سامنے آ رہے تھے جن سے متعلق احکام تدریجاً قرآن میں بھی نازل ہو رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سے متعلق سنت جاری فرما رہے تھے۔ اس وجہ سے ضرورت اس امر کی تھی کہ تعلیم و تربیت کا ایک باقاعدہ سسٹم بنایا جاتا تاکہ لوگ اس سے مستفید ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی تعمیر کی جو نہ صرف مسجد بلکہ ایک تعلیمی ادارہ بھی تھا۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک

پلیٹ فارم بنا کر اس پر چھپر ڈال دیا گیا اور یہ اس ادارے کا ہاسٹل قرار پایا۔ یہاں نمازوں کے اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمومی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جو صحابہ صفہ میں رہتے، انہیں خصوصی تعلیم دی جاتی۔ یہ حضرات دن میں اپنی معاش کا انتظام کرتے اور بقیہ وقت رسول اللہ کی خدمت میں سیکھنے میں گزارتے۔ انصار مدینہ بھی ان کی مالی امداد کر دیا کرتے تھے۔ ان میں سے جو صحابہ شادی کر لیتے یا ان کے روزگار کا انتظام ہو جاتا، وہ پھر صفہ سے نکل کر شہر میں رہائش رکھ لیتے اور نمازوں کے اوقات میں اپنی تعلیم جاری رکھتے۔ جو لوگ مسجد نبوی سے کچھ فاصلے پر رہتے تھے، ان کے لیے مقامی مساجد تعمیر کی گئیں جنہوں نے اسکول کا کام بھی کیا۔ بعض صحابہ کرام کو خصوصی تربیت دے کر ان مساجد کا امام مقرر کر دیا گیا۔

علمی مجالس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں علمی حلقے قائم فرمائے۔ صحابہ کرام ہر نماز کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے اور اس کے بعد علمی محفلیں جما کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام آپس میں بھی علمی حلقے قائم کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں دو قسم کے حلقے دیکھے: بعض صحابہ تلاوت اور ذکر میں مشغول تھے اور بعض صحابہ علم سیکھ رہے تھے۔ آپ نے دونوں کی فضیلت بیان کی اور خود علمی حلقے میں تشریف فرما ہوئے۔[11] دلچسپ امر یہ ہے کہ ان حلقوں میں وہ صحابہ بھی ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے جن کی عمر زیادہ تھی۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض صحابہ کسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر نہ ہوتے تو وہ دوسرے صحابہ سے اس کے بارے میں پوچھ لیتے۔ حضرت عمر نے تو اپنے انصاری بھائی عتبان بن مالک رضی اللہ عنہما سے یہ طے کر رکھا تھا کہ ان میں سے ایک ایک دن مجلس نبوی میں حاضر ہو گا اور دوسرا کھیتی باڑی کے کام دیکھے گا۔ واپس آ کر مجلس میں حاضر ہونے والا دوسرے بھائی کو تفصیلات بتائے گا۔ پھر اگلے دن یہی کام دوسرا کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے صحابہ کی خصوصی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے جن میں علم سیکھنے کا جذبہ ہو۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنا خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''میں نے دیکھا کہ مجھے دودھ کا ایک گلاس دیا گیا ہے اور میں اسے پیتا ہوں تو یہ میرے ناخنوں سے جاری ہو جاتا ہے۔ اس میں سے جو بچتا ہے، وہ میں عمر بن خطاب کو دے دیتا ہوں۔'' عرض کیا گیا کہ یہ کیا تھا؟ آپ نے فرمایا: ''علم۔''[12] اسی طرح آپ سیدہ عائشہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی بہت حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے کیونکہ ان میں علم کا بہت شوق تھا۔

عرب قبائل کی تعلیم و تربیت

مدینہ منورہ کے اس تعلیمی نظام کے نتیجے میں ''قُرّا'' یعنی قاریوں کا طبقہ وجود میں آیا۔ ہمارے ہاں تو قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کو قاری کہا جاتا ہے مگر عرب میں یہ لفظ ''تعلیم یافتہ'' افراد کے لیے بولا جاتا تھا جو کہ قرآن مجید کو نہ صرف پڑھ سکتے تھے بلکہ اس کے معانی

اور مفاہیم سے بھی آگاہ تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے تعلیم و تربیت کے اس سلسلے کو پورے عرب میں پھیلا دیا۔ چار صحابہ کو اس میدان میں خاص اہمیت حاصل تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کی علمیت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ”چار افراد سے قرآن سیکھیے، عبداللہ بن مسعود، سالم مولی ابو حذیفہ، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب۔“[13] رضی اللہ عنہم۔ ان میں سے خاص کر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عہد خلافت راشدہ کے نظام تعلیم میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کی تفصیل کا مطالعہ ہم آگے چل کر کریں گے۔

مدینہ منورہ کے باشندوں کے علاوہ گرد و نواح کے دیہاتیوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام یہ کیا گیا کہ ان کے لیے کم از کم جمعہ کی نماز میں شمولیت لازمی قرار دے دی گئی۔ جمعہ کے دن یہ حضرات آتے اور خطبہ جمعہ کے علاوہ بھی مدینہ میں رک کر دین سیکھتے اور پھر جا کر اپنی خواتین اور بچوں کو سکھاتے۔

دور دراز کے جو قبائل اسلام قبول کرتے، ان کی تعلیم و تربیت کے لیے دو اہتمام کیے گئے: ایک تو مدینہ کے تعلیم یافتہ قرا حضرات کو ان قبائل میں بھیجا جاتا جو انہیں قرآن اور سنت کی تعلیم دیتے۔ دوسرے یہ کہ ان قبائل کے بعض لوگ مدینہ منورہ میں آ کر رہتے اور دین سیکھ کر واپس چلے جاتے اور اپنے قبیلے کو اس کی تعلیم دیتے۔

صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد جب بہت سے قبائل دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو ان کی تعلیم و تربیت ایک بڑا چیلنج بن گیا۔ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بڑی تعداد میں صحابہ کرام کو مختلف علاقوں میں بھیجا جائے۔ چنانچہ ہر سمت میں ایک ایک صحابی کو بھیجا گیا جبکہ یمن کی جانب دو صحابہ کو بھیجا گیا۔ اس کی وجہ یہ رہی ہو گی کہ یمن کے علاقے میں زرخیزی کے سبب آبادی زیادہ رہی ہو گی۔ یہاں سے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ، جو اس وقت نوجوان تھے، مدینہ آئے اور انہوں نے تعلیم حاصل کی اور قرآن کے ایسے ماہر قاری بنے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلاوت کو حضرت داؤد علیہ الصلوۃ والسلام کا نغمہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: ”ابو موسی! آپ کو تو آل داؤد کے نغموں میں سے ایک نغمہ عطا ہوا ہے۔“[14]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر حضرت معاذ بن جبل کو حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہما کے ساتھ بحیثیت معلم یمن بھیجا اور انہیں خصوصی ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: ”آپ دونوں، لوگوں کے لیے آسانی کیجیے گا، مشکل نہیں۔ انہیں دین سے رغبت دلائیے گا، نفرت نہیں۔“[15] آپ نے انہیں مزید حکم دیا کہ اہل یمن کو تدریج سے دعوت دیجیے۔ پہلے ایمان پر زور دیجیے اور انہیں توحید سکھائیے، پھر نماز کی عادت ڈالیے اور پھر زکوۃ کا حکم دیجیے۔[16]

فتح مکہ کے بعد جب کثیر تعداد میں قبائل نے اسلام قبول کیا تو ان کی تعلیم و تربیت کا مستقل انتظام یہی ممکن تھا کہ ہر قبیلے میں سے کچھ لوگ دین سیکھ کر اپنی اپنی قوم کو سکھائیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں باقاعدہ اس کا حکم دیا گیا:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ

يَحْذَرُونَ.

اہل ایمان کے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ وہ سب کے سب (تعلیم کے لیے) نکل کھڑے ہوں تو ایسا کیوں نہیں ہو تا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے تا کہ وہ دین میں گہری بصیرت حاصل کریں اور پھر واپس آ کر اپنی قوم کو خبر دار کریں تا کہ یہ لوگ (امور دینی میں) محتاط رہیں۔ (التوبہ 9:122)

چنانچہ اس عمل پر حکم کے لیے ہر ہر قبیلے کے لوگ مدینہ آئے، انہوں نے دین سیکھا اور اپنے اپنے علاقے میں جا کر مساجد تعمیر کیں اور درس گاہیں قائم کیں جہاں پر قرآن کی تعلیم اسی پیٹرن پر دی جانے لگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قائم فرمایا تھا۔

تعلیم وتربیت کا نصاب

یہ بات ہم واضح کر چکے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت کے نصاب میں قرآن مجید کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے احکام کو عملی شکل میں جاری فرما رہے تھے جسے بالعموم سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن وسنت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ نصاب تعلیم میں وہ علوم وفنون بھی شامل ہوتے چلے گئے جن کی حیثیت اصل کی نہیں بلکہ معاون علم کی تھی۔ ان میں سب سے نمایاں علم فن کتابت تھا۔ عربوں کے ہاں لکھنے پڑھنے کا زیادہ رواج نہ تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو اس فن کا مرکز بنا دیا۔ یہاں تک کہ اہل مکہ میں سے بعض پڑھے لکھے لوگ جنگ بدر میں جنگی قیدی بنے تو ان کا فدیہ یہ طے پایا کہ وہ دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں گے۔ جو صحابہ لکھنا پڑھنا جانتے اور مختلف فنون سیکھتے، انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصوصی توجہ سے نوازتے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو آپ نے نہ صرف علوم القرآن بلکہ عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا تا کہ یہود و نصاری سے بات میں آسانی ہو۔[17] آپ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو بھی عبرانی سیکھنے کا حکم دیا اور آپ تورات کے عالم بنے۔

دین کے ساتھ دنیاوی علوم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں جن اشیا سے علاج کا رواج تھا، آپ نے ان کے بہت سے طبی فوائد بتائے ہیں اور اس پر ''طب نبوی'' کے عنوان سے بہت سی کتب لکھی گئی ہیں۔ مدینہ میں حجام بھی موجود تھے جو حجامت (Cupping) کیا کرتے تھے۔ یہ ایک خاص طریقہ علاج تھا جس میں جسم کے مخصوص مقامات سے خون نکالا جاتا تھا۔ رسول اللہ نے حکم دیا کہ باپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچے کو فن تحریر، تیر اندازی اور تیراکی سکھائے۔[18] گھوڑوں اور اونٹوں کی پرورش کا آپ نے خصوصی اہتمام فرمایا اور فن شہسواری کی سرپرستی فرمائی۔ آپ باقاعدہ گھوڑوں اور اونٹوں کی دوڑ کروایا کرتے تھے۔[19]

اگلی نسلوں کی تربیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلی نسلوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔ ان میں زیادہ تر وہ بچے تھے جو عہد نبوی میں پیدا

ہوئے۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ جنگ بدر کے بعض قیدیوں کا فدیہ یہ قرار پایا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں گے۔ اس طرح سے مدینہ منورہ علم و فکر کا مرکز بن گیا اور خلفائے راشدین کے دور میں جب یہی بچے جوان ہوئے تو انہوں نے بہت سے ایسے علمی کارنامے انجام دیے جس کی مثال اس سے پہلے عربوں کے ہاں نہیں ملتی ہے۔

عربوں کے ذہن میں نفسیاتی تبدیلی

اس تعلیم وتربیت کے نتیجے میں عربوں کے ذہن میں متعدد نفسیاتی تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کا خلاصہ ہم یہاں بیان کر رہے ہیں:

1۔ ہر انسان کے ذہن میں چند بنیادی فلسفیانہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کیا اس کائنات کا کوئی خالق ہے؟ اگر ہاں، تو اس سے میرا تعلق کیا ہے؟ مرنے کے بعد میں کہاں چلا جاؤں گا؟ ان سوالات کے جواب کا تعین انسان جب کرتا ہے، تو یہی اس کی زندگی کا لائحہ عمل بنتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر بات پر یقین کر لے کہ میں بس ایسے ہی کسی ارتقا کے عمل کے نتیجے میں تخلیق ہو گیا، اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے اور میں اس کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں تو اس کی زندگی اس شخص سے بالکل مختلف ہو گی جو کائنات کا ایک خالق مانتا ہے اور خود کو اس کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایسا شخص، جسے ان سوالات کو کوئی حتمی جواب نہیں مل پا رہا اور وہ کنفیوژن کا شکار ہے، تو اس کی زندگی کا لائحہ عمل کچھ اور ہو گا۔

دور جاہلیت کے عربوں کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ وہ ان بنیادی فلسفیانہ سوالات کے بارے میں کنفیوز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غالب اکثریت اسی زندگی سے متعلق سوچتی تھی اور موت کے بعد کی زندگی ان کے لیے اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ حنفا کے ہاں البتہ سوچنے سمجھنے کی روایت موجود تھی مگر انہیں کوئی متعین اور حتمی جواب نہیں ملتا تھا۔ ایک خالق کائنات کو عرب مانتے تھے لیکن ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ جن دیوی دیوتاؤں کی وہ عبادت کرتے ہیں، وہ انہیں خدا سے قریب کرتے ہیں۔ اگر کوئی آخرت ہوئی بھی، تو اس میں یہ دیوی دیوتا انہیں بچا لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جواب دہی (Accountability) کا کوئی تصور ان کے ہاں موجود نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور تعلیم وتربیت کے نتیجے میں عربوں کو ان بنیادی سوالات کا حتمی جواب مل گیا۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا لائحہ عمل ہی بدل گیا۔ ان کی نفسیات مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ اب وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ سمجھنے لگے۔ ان کی زندگیوں کا محور و مرکز ہی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسی کمیونٹی وجود میں آئی جو اخلاقی اعتبار سے نسل انسانی کا بہترین گروہ تھا۔

2۔ عربوں میں لاابالی پن پایا جاتا تھا۔ ان کی زندگی کا محور ہی قبیلہ پرستی، جنگ، مال غنیمت اور مادی زندگی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں اس لاابالی پن کا خاتمہ ہوا اور یہ زندگی کے مسائل کو سنجیدگی سے لینے لگے۔ اس کے نتیجے میں ان میں انسانیت پیدا ہوئی اور وہ خود کو ایک بڑے سنجیدہ مشن پر مامور سمجھنے لگے۔

3۔ عربوں میں پہلے علم سیکھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں ان میں سیکھنے کا جذبہ پیدا

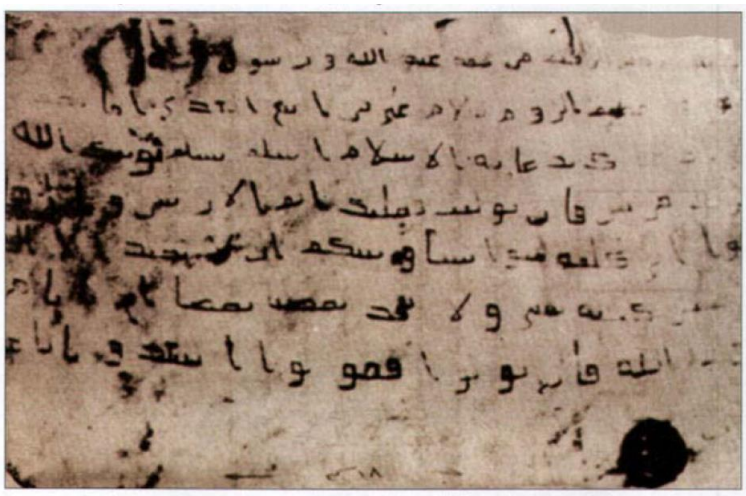
ہوا۔

عہد نبوی میں علم و دانش

اس سیکشن میں ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ عہد نبوی میں کون کون سے علوم و فنون کس طریقے سے ارتقا پذیر ہوئے؟ علوم و فنون کا ارتقا ہمیشہ ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ جیسے جیسے انسانی ضروریات ارتقا پذیر ہوتی ہیں، ویسے ویسے سوالات لوگوں کے ذہنوں میں آتے ہیں اور وہ اپنے اہل علم اور صاحب دانش افراد کے سامنے ان سوالات کو رکھتے ہیں۔ اس سے غور و فکر کا پراسیس تیز ہوتا ہے اور علوم و فنون ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ علم و دانش کو پھیلانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن امور کا اہتمام فرمایا، پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ عہد نبوی میں کن کن علوم کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا؟

فن تحریر

عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دور جاہلیت میں بہت کم تحریروں کا ذکر ملتا ہے، ہاں اہل کتاب کے ہاں لکھی ہوئی کتب موجود تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن لکھوانا شروع کیا تو یہ پہلی باقاعدہ کتاب تھی جو عربوں کے ہاں لکھی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فن کی اس قدر حوصلہ افزائی فرمائی کہ مدینہ کے بچوں کو باقاعدہ اس کی تعلیم دی جانے لگی۔ جنگ بدر کے بعض قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ رسول اللہ کے ساتھ کچھ ایسے صحابہ تھے جو اسی خدمت پر مقرر تھے کہ وہ آپ کے حکم پر وحی اور خطوط لکھا کرتے تھے۔ اس طرح سے مسلمانوں کے ہاں علم و فن کے فروغ کا دروازہ کھل گیا۔ اگرچہ اس دور کا رسم الخط بالکل ابتدائی نوعیت کا تھا لیکن جب مسلمانوں کے ہاں لکھنے کا آغاز ہوا تو چند ہی عشروں میں یہ فن ترقی کر کے ایک بڑا آرٹ بن گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منسوب اس خط کی تصویر ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔



رسالة الرسول ﷺ إلى هرقل ملك الروم

ہرقل کے نام نامہ مبارک۔(بشکریہ: سامی بن عبداللہ الملغوث۔ ص181)

قرآن مجید اور اس سے متعلق علوم

جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ عہد نبوی میں قرآن مجید ہی تعلیم کا محور کا مرکز تھا۔ صحابہ کرام کی علمی و فکری کاوشیں قرآن مجید کو سمجھنے اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے ہی میں صرف ہوا کرتی تھیں۔ قرآن چونکہ نہایت ہی واضح عربی زبان، جسے "عربی مبین" کہا گیا ہے، میں نازل ہو رہا تھا، اس وجہ سے صحابہ کرام کو اسے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی۔ وہ قرآن مجید کو نہ صرف دیکھ کر اس کی تلاوت کیا کرتے تھے بلکہ اسے حفظ بھی کر لیتے تھے اور نمازوں میں یا نماز سے باہر اس کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ یہ تلاوت مفاہیم کو سمجھے بغیر نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ صحابہ قرآن میں غور و فکر کرتے اور اس سے اپنی زندگی کی راہنمائی اخذ کرتے۔ اگر انہیں کوئی مسئلہ پیش آجاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر لیتے۔

عہد نبوی ہی میں بعض صحابہ قرآن مجید پر غور و فکر کے لیے ممتاز ہو چکے تھے اور ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ قدیم الاسلام صحابہ میں حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم بھی اپنے علم و فکر میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ صحابیات میں امہات المومنین اور بالخصوص سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس معاملے میں خاص مقام رکھتی تھیں۔

بعض صحابہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید سن کر اسے اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح ان صحابہ نے قرآن کے اپنے اپنے نسخے بھی تیار کیے جنہیں "مصحف" کہا جاتا ہے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کو تاریخ میں شہرت نصیب ہوئی۔ ان نسخوں کی حیثیت ذاتی ڈائری کی ہوا کرتی تھی اور انہیں پھیلانا مقصود نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بعض اوقات قرآن کا کچھ حصہ نوٹ کر لیا جاتا تھا اور کچھ حصہ نوٹ نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ وہ ان صحابی کو یاد ہوتا تھا۔ بعض صحابہ رسول اللہ سے کسی آیت کی تفسیر سن کر اسے بھی اپنے مصاحف میں نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا تاکہ قرآن مجید کے ٹیکسٹ میں کسی اور چیز کا اضافہ نہ ہو جائے۔ ہاں آپ نے اپنی احادیث بیان کرنے کی اجازت ضرور دی۔[20] اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی ماسٹر کاپی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تیار کروا رہے تھے اور آپ اپنے کاتبین وحی سے قرآن لکھوایا کرتے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماسٹر کاپی دو تختیوں کے درمیان بندھی ہوئی تھی تاکہ اس میں کوئی اضافہ یا کمی نہ کی جا سکے۔[21]

سنت نبوی اور اس سے متعلق علوم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو صرف قرآن مجید ہی نہیں دیا بلکہ اس کے ساتھ دین کے احکام کو عملی شکل میں جاری فرمایا۔ اسے آپ کی سنت کہا جاتا ہے۔ جیسے قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم ہے مگر اس کا طریقہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کی

تمام ترکیفیات کو اگر محض الفاظ میں بیان کر دیا جاتا تو ان کی تعبیر و تشریح میں بہت اختلافات ہو جاتے۔ جیسے عربی میں لفظ ''سجدہ'' جھکنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ کوئی شخص اس سے مراد ہلکا سا سر خم کرنا لے لیتا، کوئی رکوع جیسی شکل بنالیتا اور کوئی اسی طرح سجدہ کرتا جیسا ہم کرتے ہیں۔ یہی معاملہ دیگر عملی احکام جیسے روزہ، زکوۃ، حج، نکاح و طلاق، زراعت، تجارت وغیرہ کا ہوتا۔ وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عملی شکل میں جاری فرمایا۔ اسے ''سنت'' کا نام دیا گیا۔

صحابہ کرام جب اس سنت پر عمل کیا کرتے تھے تو بہت سی باتیں زیر بحث آ جایا کرتی تھیں۔ اس طرح سے اس سنت کا علمی ریکارڈ حدیث کی صورت میں مرتب ہونے لگا۔ عہد نبوی ہی میں بعض صحابہ ایسے تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو نوٹ کر کے یاد کرنا شروع کر دیا۔ ان میں بالخصوص حضرت علی، ابوہریرہ، عبداللہ بن عمرو بن عاص اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم نمایاں ہوئے۔ حضرت علی اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم نے تو بعض احادیث نبوی کو تحریری طور پر مدون کیا۔[22]

علم الفقہ

قرآن اور سنت کے احکام کا اطلاق جب عملی زندگی پر کیا جائے تو اس کے نتیجے میں علم فقہ وجود میں آتا ہے۔ عہد نبوی میں تمام دینی علوم کا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ آپ اللہ تعالی سے براہ راست احکام حاصل کرتے۔ اگر وحی نہ آتی تو آپ خود اجتہاد فرماتے اور بعد میں آپ کے اجتہاد کی توثیق اللہ تعالی کی جانب سے کر دی جاتی۔ اگر اللہ تعالی اس اجتہاد کو برقرار نہ رکھنا چاہتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دے دیتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ آپ اس اجتہاد میں اہل کتاب کی موافقت کو پسند فرماتے تھے۔[23]

عہد نبوی میں صحابہ کرام بھی اجتہاد کیا کرتے تھے۔ بعض لوگ اپنے مقدمات لے کر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آ جاتے اور انہیں ثالث بنا لیتے۔ یہ حضرات ضرورت پڑنے پر اجتہاد کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی توثیق یا اصلاح کروا لیتے۔ اسی طرح جب بعض صحابہ دور دراز سفر پر جاتے تو وہاں بھی اجتہاد کرتے اور واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اجتہاد کی توثیق یا اصلاح کروا لیتے۔ جیسے ایک واقعہ ہے کہ ایک صحابی کو دوران سفر غسل کی ضرورت پیش آ گئی اور پانی دستیاب نہیں تھا۔ تیمم پر قیاس کرتے ہوئے وہ مٹی پر لوٹنے لگے۔ واپس آ کر جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پوچھی تو آپ نے وضاحت فرمائی کہ غسل کی صورت میں بھی تیمم اسی طرح کرنا چاہیے جیسے وضو کی صورت میں کیا جاتا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو ان سے پوچھا کہ آپ فیصلے کس طرح کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا: ''کتاب اللہ کے مطابق۔'' فرمایا: ''اگر اس میں کوئی حکم نہ ملے۔'' تو عرض کیا: ''اللہ کے نبی کی سنت کے مطابق۔'' فرمایا: ''اس میں بھی کوئی حکم نہ ملے۔'' عرض کیا: ''پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات سن کر اس کی تحسین فرمائی۔[24]

علم فقہ کی ایک خاص شاخ ''علم الفرائض'' تھی جس کا تعلق وراثت کی تقسیم سے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس علم کو سیکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ''قرآن اور علم الفرائض سیکھیے اور لوگوں کو سکھایئے۔''[25] علم میراث کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے سیکھنے کے لیے ریاضی کا آنا ضروری ہے۔ عہد نبوی میں بعض صحابہ فتوی بھی دیا کرتے تھے۔ ان میں حضرت ابو بکر، عمر، عثمان، علی، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، عبد الرحمن بن عوف، عبد اللہ ب ن مسعود، معاذ بن جبل اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔[26] (رضی اللہ عنہم)

اس طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اکابر صحابہ کے اجتہادات کا ایک ذخیرہ وجود میں آنے لگا اور بعض نوجوان صحابہ جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان امور کو روایات کی صورت میں نوٹ کرنے لگے۔ روایت سے مراد کسی واقعے کا ایک مختصر رپورٹ (Anecdote) کی شکل میں بیان ہے۔ یہی وہ فارمیٹ ہے جس میں ابتدائی زمانے میں نہ صرف حدیث اور فقہ بلکہ تمام علوم کو ریکارڈ کیا گیا۔

تاریخ

قرآن مجید سابق انبیا کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی تاریخ سے بھرا ہوا ہے تاہم اس میں ہمیں وہی واقعات ملتے ہیں جن سے کوئی خاص سبق سکھانا مقصود ہو۔ جب مسلمان ان واقعات کو پڑھتے تو ان کے ذہنوں میں ان کی مزید تفصیلات جاننے کا شوق پیدا ہوتا۔ اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی اجازت دے دی کہ بنی اسرائیل سے ان کی تاریخی روایات حاصل کی جائیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔[27] تاہم ان کی ایسی روایات جو قرآن مجید اور عقل عام کے خلاف ہوں، کو قبول نہیں کیا گیا۔ خود قرآن مجید میں ہمیں بنی اسرائیل کی بعض تاریخی روایات، جن میں مثلاً حضرت داؤد و سلیمان علیہما الصلوۃ والسلام کی کردار کشی ہے، کی تردید ملتی ہے۔ اہل کتاب کی معقول اور مستند تاریخی روایات ان صحابہ و تابعین سے حاصل کی گئیں جو کہ اسلام لا چکے تھے۔ ان میں خاص کر حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور کعب الاحبار شامل ہیں۔

بعض ضعیف روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بعض قصہ گو موجود تھے، جو تاریخی قصے سنایا کرتے تھے۔[28] اس طرح سے مزید تاریخی معلومات مسلمانوں تک پہنچا کرتی تھیں۔ بعض صحیح احادیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی اسرائیل اور اہل عرب کے ایسے قصے منقول ہیں جن سے انسان کو نصیحت حاصل ہوتی ہے۔

فلسفہ

عربوں کے ہاں یونانیوں کی طرز پر فلسفیانہ روایت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہاں دین شرک کی صورت میں مختلف قسم کی توہم پرستی پھیلی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں بڑا واضح موقف اختیار فرمایا کہ اللہ تعالی ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ آپ نے دیوی دیوتاؤں کے تصور کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ عربوں کو اس بات پر قائل بھی کر لیا کہ یہ

دیوی دیوتا محض انسانی تخیل کی پیداوار ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ. وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ. أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ. تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ. إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ.

کیا آپ نے لات اور عزی پر غور کیا ہے اور اس تیسری منات پر بھی۔ کیا آپ لوگوں کے لیے نرینہ (اولاد) ہے اور اس (اللہ) کے لیے زنانہ۔ یہ تو عجیب تقسیم ہوئی؟ یہ محض وہ نام ہیں جو آپ لوگوں اور آپ کے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں اور اللہ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔ (جنہوں نے یہ نام رکھے) وہ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں حالانکہ آپ کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔ (النجم 53:19-23)

قرآن مجید میں بار بار اللہ تعالی کی قدرت اور تخلیق میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ اسی سے انسان اپنے رب کو پہچان سکتا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ. الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور دن اور رات کے فرق میں اہل عقل کے لیے بہت سے دلائل ہیں۔ یہ (اہل عقل) وہ لوگ ہیں جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر (لیٹے ہوئے) یاد کرتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے ہیں (اور عرض کرتے ہیں کہ) "ہمارے رب! آپ نے یہ سب کچھ بے کار نہیں بنایا۔ آپ پاک ہیں، ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لیجیے۔" (آل عمران 3:190-191)

قرآن مجید میں یہ مضمون بہت سے مقامات پر آیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام اللہ تعالی کی تخلیق میں غور کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس معاملے میں تنبیہ فرمائی: "شیطان آپ میں سے کسی کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے: 'فلاں چیز کو کس نے بنایا؟ فلاں چیز کو کس نے بنایا؟' یہاں تک کہ وہ یہ پوچھتا ہے: 'تمہارے رب کو کس نے بنایا؟' تو جب وہ اس مقام پر پہنچے تو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور اس غور و فکر کو چھوڑ دینا چاہیے۔"[29] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مطلب یہ تھا کہ مخلوق کے لیے خالق ہونا ضروری ہے مگر خالق کے لیے کوئی اور خالق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے ایسے خیال پر اللہ تعالی کی پناہ مانگنی چاہیے۔

اللہ تعالی کی تخلیق میں تو غور ضرور کیا جائے مگر اللہ تعالی کی ذات میں غور نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ انسانی عقل کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ مخلوق میں غور کرنے سے انسان کو خالق کائنات کے خود پر احسانات کا احساس ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالی کی ذات پر غور کرنے سے انسان الہیاتی فلسفے کے ایسے میدان میں داخل ہو جاتا ہے جہاں وہ کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا ہے۔ یونانی اور دیگر فلسفیوں سے غلطی یہی ہوئی کہ انہوں نے اپنی محدود عقل سے خالق کی لامحدود ذات کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس سے ان کی فکر غلط سمت میں چلی گئی۔ مخلوق میں غور کا فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان اس میں غور کر کے کائنات کی چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال میں لا سکتا ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی

کائنات میں غور و فکر کے بارے میں موجود قرآنی ترغیب کی وجہ سے عہد نبوی ہی سے مسلمانوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی جانب رغبت پیدا ہوئی۔ اولین دور کے مسلمان خالق کی بجائے مخلوق میں غور کرنے لگے اور سائنسی حقیقتوں کو دریافت کرنے لگے۔ چونکہ عرب سائنس اور ٹیکنالوجی میں دیگر اقوام سے پیچھے تھے، اس وجہ سے انہوں نے دیگر اقوام کے سائنسی علوم حاصل کرنے کی طرف توجہ دی۔ اگرچہ یہ پراسیس عہد رسالت میں شروع نہ ہوا تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں سمت ضرور واضح فرمادی تھی کہ دیگر اقوام کے مفید دنیاوی علوم حاصل کرنے میں نہ صرف کوئی حرج نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو آگے بڑھ کر یہ علوم حاصل کرنے چاہییں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں خود مثالیں قائم فرمائیں۔ جیسے غزوہ خندق کے موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے خندق کھودی جو کہ ایرانی طریقہ دفاع تھا۔ جب عرب حملہ آور مدینہ پہنچے تو وہ اس طریقے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اسی طرح غزوہ طائف کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعے کی دیوار توڑنے کے لیے منجنیق استعمال کروائی جس کا عربوں کے ہاں رواج کم تھا۔ عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت ہی کم تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو نہ صرف لکھوایا بلکہ مسلمانوں کو فن کتابت سکھانے کا اہتمام کروایا۔ ان مثالوں سے صحابہ کرام پر یہ واضح ہو گیا کہ دیگر اقوام کے مثبت اور مفید علوم سیکھ کر انہیں استعمال میں لانا چاہیے اور ان سے دینی اور دنیاوی فوائد حاصل کرنے چاہییں۔

انسانی اور سماجی علوم (Humanities and Social Sciences)

زمانہ قدیم اور قرون وسطی میں علوم انسانی اور سوشل سائنسز نے ابھی علیحدہ علیحدہ مضامین کی شکل اختیار نہ کی تھی بلکہ یہ سب "فلسفہ و حکمت" کے جامع عنوان کے تحت ہی آتے تھے۔ دیگر علوم کی طرح اس معاملے میں بھی یونانی علوم رومن ایمپائر میں پھیلے ہوئے تھے مگر عرب میں یہ زیادہ پھیل نہیں سکے تھے۔ اس کے باوجود ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں علم نفسیات (Psychology)، عمرانیات (Sociology)، سیاسیات (Political Science)، بشریات (Anthropology)، اور معاشیات (Economics) کی ایسی باتیں ملتی ہیں جو محض کسی فلسفی کے غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں بلکہ اس خدائی حکمت (Divine Wisdom) کا حصہ ہیں جو اللہ تعالی نے براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی تھی۔ یہاں چند مثالیں ہم پیش کر رہے ہیں:

اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔[30] (علم نفسیات)

دین تو اللہ، اس کے رسول، مسلمانوں کے حکمرانوں اور ان کے عوام کے لیے خیر خواہی کا نام ہے۔[31] (علم نفسیات اور عمرانیات)

ایک شخص کے اسلام کی خوبی یہی ہے کہ وہ بے مقصد چیزوں کو چھوڑ دے۔[32] (نفسیات و عمرانیات و معاشیات)

مال و دولت کی کثرت کا نام دولت مندی نہیں ہے۔ دولت مندی تو دل کی امیری کا نام ہے۔[33] (نفسیات و معاشیات)

آپ میں سے کوئی اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔[34] (عمرانیات)

پانچ چیزوں میں مبتلا ہونے سے آپ (اللہ کی پناہ مانگیے) اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ آپ ان چیزوں میں مبتلا ہوں۔ (1) جس قوم میں فحاشی اعلانیہ ہونے لگے تو اس میں طاعون اور ایسی ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان سے پہلے لوگوں میں نہ تھیں۔ (2) جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو وہ قحط مصائب اور بادشاہوں کے ظلم و ستم میں مبتلا کر دی جاتی ہے۔ (3) جب کوئی قوم اپنے اموال کی زکوٰۃ نہیں دیتی تو بارش روک دی جاتی ہے اور اگر چوپائے نہ ہوں تو ان پر کبھی بھی بارش نہ برسے۔ (4) جو قوم اللہ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑتی ہے تو اللہ تعالی غیروں کو ان پر مسلط فرما دیتا ہے جو اس قوم سے عداوت رکھتے ہیں پھر وہ ان کے اموال چھین لیتے ہیں۔ (5) جب مسلمان حکمران کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالی کے نازل کردہ نظام میں (مرضی کے کچھ احکام) اختیار کر لیے ہیں (اور باقی چھوڑ دیتے ہیں تو اللہ تعالی اس قوم کو خانہ جنگی اور باہمی اختلافات میں مبتلا فرما دیتے ہیں۔[35] (معاشیات و سیاسیات و عمرانیات)

ایک شخص جو طویل سفر کر کے آتا ہے، اس کا سر غبار آلود ہے اور وہ دعا کرتا ہے: "یارب، یارب" اس کی حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے، پینے کی اشیا حرام مال کی ہیں، لباس حرام مال سے بنا ہوا ہے اور اسے حرام کی غذا دی گئی ہے۔ اس کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟[36] (معاشیات)

جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ یا تو اچھی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے۔ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔[37] (عمرانیات)

احادیث نبوی کا مطالعہ کیا جائے تو بلا مبالغہ ایسی ہزاروں احادیث ملتی ہیں جن کا تعلق علوم انسانی اور سماجی علوم سے ہے۔ تاہم ان احادیث میں ان علوم میں "کیا ہے؟" کی نسبت "کیا کرنا چاہیے؟" کا پہلو زیادہ ملتا ہے یعنی Positive Science کی نسبت یہ علوم عہد نبوی میں Normative Science کے طور پر موجود تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ تمام علوم سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ علوم بھی مسلمانوں کے اندر رواج پا گئے۔

دوسری زبانوں کا علم

اسلام کا مشن چونکہ گلوبل نوعیت کا تھا، اس وجہ سے ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمان دیگر زبانیں بھی سیکھیں تاکہ ان قوموں تک اپنی دعوت پہنچا سکیں۔ عہد نبوی میں اس دعوت کا دائرہ چونکہ عربوں تک محدود تھا، اس لیے دیگر زبانیں سیکھنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ تاہم چند صحابہ ایسے تھے جنہوں نے یہ زبانیں سیکھیں۔ ان میں سب سے نمایاں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبرانی یا سریانی سیکھنے کا حکم دیا۔[38] اس کا مقصد یہ تھا کہ یہود و نصاری کے گفتگو کی جا سکے اور

ان کے نقطہ نظر کو صحیح طور پر سمجھ کر ان کے سامنے دعوت پیش کی جا سکے۔ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کے بارے میں بھی ملتا ہے کہ وہ عبرانی زبان سمجھتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا تعلق ہی چونکہ ایران سے تھا، اس لیے وہ فارسی زبان جانتے تھے اور بعض ضعیف روایات کے مطابق انہوں نے قرآن مجید کا جزوی ترجمہ بھی فارسی زبان میں کیا تھا۔ اس کا مقصد نو مسلموں کو قرآن کے مفاہیم سے آگاہ کرنا تھا۔[39]

---

[3] بخاری۔ کتاب بدء الوحی۔ حدیث 2

[4] ایضا۔ حدیث 3

[5] ایضا۔ حدیث 5

[6] بخاری۔ کتاب العلم۔ حدیث 101

[7] بخاری۔ کتاب الایمان۔ حدیث 29

[8] بخاری۔ کتاب العلم۔ حدیث 130

[9] الشوری 42:38

[10] بخاری۔ کتاب المناقب۔ حدیث 3710

[11] ابن ماجہ۔ کتاب العلم۔ حدیث 229

[12] بخاری۔ کتاب العلم۔ حدیث 82

[13] بخاری۔ کتاب المناقب۔ حدیث 3597

[14] بخاری۔ کتاب فضائل القرآن۔ حدیث 4761

[15] بخاری۔ کتاب المغازی۔ حدیث 4086

[16] بخاری۔ کتاب التوحید۔ حدیث 6937

[17] ترمذی۔ کتاب الاستیذان۔ حدیث 2715

[18] بیہقی، شعب الایمان۔ حدیث 8665

[19] بخاری۔ کتاب الاعتصام والسنۃ۔ حدیث 6905

[20] مسلم۔ کتاب الزہد۔ حدیث 3004۔ مسند احمد، باب ابو ہریرہ، حدیث 10670

[21] بخاری۔ کتاب فضائل القرآن۔ حدیث 4731

[22] صحیفہ حضرت علی کا بیان بخاری، حدیث 6507 میں ہے۔ ابن عمر کے صحیفے کا ذکر ترمذی، حدیث 3529 میں ہے۔، بخاری، مستدرک، ابن سعد

[23] بخاری۔ کتاب المناقب۔ حدیث 3365

[24] ترمذی۔ کتاب البیوع۔ حدیث 1327۔ ابو داؤد۔ اول کتاب الاقضیہ۔ حدیث 3592

[25] ترمذی۔ کتاب الفرائض۔ حدیث 2091

[26] کتانی۔1/113-114

[27] بخاری۔کتاب الانبیا۔حدیث3274

[28] کتانی۔2/226-227

[29] بخاری۔کتاب بدء الخلق۔حدیث3102

[30] بخاری و مسلم۔حدیث1

[31] مسلم۔حدیث95

[32] ترمذی۔کتاب الزہد۔حدیث2317

[33] بخاری۔کتاب الرقاق۔حدیث6081

[34] بخاری۔کتاب الایمان۔حدیث13

[35] ابن ماجہ۔کتاب الفتن۔حدیث4019

[36] مسلم۔کتاب الزکوۃ۔حدیث1015

[37] بخاری۔کتاب الرقاق۔حدیث6110

[38] ترمذی۔کتاب الاستیذان۔حدیث2715

[39] نووی۔المجموع شرح المہذب۔؟؟؟

سیکشن C: دعوتی تاریخ

باب 5: دعوت اسلام کی نوعیت

اکثر مسلم سیرت نگاروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے سیاسی اور عسکری پہلوؤں کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آپ کی حیات طیبہ کا دعوتی پہلو ان کی دلچسپی کا موضوع نہیں بن سکا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کن کن طریقوں سے لوگوں کے سامنے پیش کی؟ اس دعوت کی قبولیت کے نفسیاتی اور عمرانی اسباب کیا تھے؟ عربوں کے ذہن کیسے تبدیل ہوئے؟ مختلف مذہبی گروہوں کے سامنے یہ دعوت پیش کرنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی گئی؟ کون کون سے مباحث اٹھائے گئے؟ کن کن سوالات کے جوابات دیے گئے؟ اہل مکہ، اہل مدینہ اور دیگر عرب قبائل میں دعوت کیسے پہنچی اور کس طریقے سے وہاں دعوتی کام کیا گیا؟ عالمی طاقتوں کے حکمرانوں تک دعوت کیونکر پہنچائی گئی اور اس کے کیا نتائج نکلے؟ ان حکمرانوں نے کیا ردعمل ظاہر کیا اور اس کے اسباب کیا تھے؟ یہ سب وہ امور ہیں جن کا ذکر ضمنی طور پر سیرت طیبہ کی کتابوں میں ملتا ہے لیکن اسے موضوع بنا کر اس پر مفصل کام کیا جانا ابھی باقی ہے۔ غیر مسلم سیرت نگاروں نے البتہ ان سوالات کو باقاعدہ موضوع بنا کر کام کیا ہے۔ اس باب میں ہم ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اس سے پہلے چند اصولی مباحث کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ دعوت نبوی کی نوعیت سمجھ میں آسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کیا تھی؟

قانون دینونت (Law of Divine Reward and Punishment) کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ کسی بھی نبی و رسول کی دعوت و تبلیغ کو عام مبلغین کی دعوت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی دعوت کو تاریخ عالم میں ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اللہ تعالی نے انسانیت کی ہدایت کے لیے یہ اہتمام فرمایا ہے کہ ان میں ہزاروں ایسے پیغمبر بھیجے ہیں، جنہوں نے آسمانی ہدایت سے انسانیت کو فیض یاب کیا۔ ان پیغمبروں کا کام یہی تھا کہ وہ انسانوں کو اللہ تعالی کے حضور پیش ہونے کے لیے تیار کریں اور انہیں بتائیں کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب انہیں اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے گا۔ اس حقیقت کو سمجھنا چونکہ بعض انسانوں کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس کے لیے اللہ تعالی نے اضافی اہتمام یہ فرمایا کہ انہی پیغمبروں میں سے بعض کو منتخب کر کے ان کے ذریعے اس جزا و سزا کو دنیا ہی میں قائم کر کے دکھا دیا۔ ان میں حضرت نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، شعیب، موسی، عیسی اور محمد علیہم الصلوۃ والسلام نمایاں ہیں۔

ان رسولوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ابتدا ہی سے اپنے مخاطبین پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اللہ تعالی کی

جزا و سزا کا ایک نمونہ اس دنیا میں قائم کرنے آئے ہیں۔ ان کے جو مخاطبین ان پر ایمان لائیں گے، انہیں اسی دنیا میں ان کی نیکی کا بدلہ دے دیا جائے گا اور جو ان کا انکار کریں گے، انہیں اسی دنیا میں عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔ اس اہتمام کا مقصد یہ تھا کہ یہ دنیا کی دیگر اقوام کے لیے یہ بات بالکل آخری درجے میں ثابت ہو جائے کہ ان سب کا یہی انجام آخرت میں ہونے والا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام پر ایمان نہ لانے والوں کو اسی دنیا میں سیلاب کے ذریعے ڈبو دیا گیا اور حضرت ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم الصلوۃ والسلام کی اقوام مختلف آسمانی لشکروں جیسے زلزلے، تیز آندھی، پتھروں کی بارش اور اس نوعیت کی آفات کا شکار ہو گئیں۔ یہی معاملہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے مقابلے پر آنے والا فرعون غرق ہوا۔ ان تمام پیغمبروں کے پیروکاروں کو دنیا ہی میں سرفرازی عطا کی گئی جو کہ ان کے نیک اعمال کی جزا تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام (1976-1801BC) سے اللہ تعالیٰ نے ایک اضافی انتظام یہ فرمایا کہ ان کی اولاد اور پیروکاروں کو دنیا ہی میں جزا و سزا کا نمونہ بنا دیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے جب بھی نیکی کی روش اختیار کی، انہیں اسی دنیا میں جزا دی گئی اور حضرت داؤد و سلیمان علیہما الصلوۃ والسلام کے زمانے (1040-930BC) میں ان کی خوشحالی کا عالم یہ تھا کہ وقت کی بڑی بڑی طاقتیں انہیں رشک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ پھر جب بنی اسرائیل نے برائی کا راستہ اختیار کیا تو انہیں نبوکد نضر کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا کرنا پڑا جس نے 586BC میں یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر جب انہوں نے توبہ کا راستہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے سائرس اعظم (576-530BC) کی شکل میں ایک بہترین مددگار انہیں عطا کیا اور یہ ایرانی سرپرستی میں اطمینان سے رہنے لگے۔ اس کے بعد پھر ان میں بگاڑ پیدا ہوا تو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام (0-33CE) اللہ تعالیٰ کی آخری برہان بن کر ان کے پاس آئے اور جب انہوں نے حضرت عیسیٰ کو جھٹلایا تو 70CE میں رومیوں نے ایک بار پھر یروشلم کو تباہ کر کے یہودیوں کو پوری دنیا میں جلاوطن کر دیا۔

بعینہ یہی معاملہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پیش آیا۔ آپ کی سیرت طیبہ کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل شروع سے یہی بات اہل مکہ کے سامنے رکھی کہ اگر یہ آپ پر ایمان لا کر آپ کا ساتھ دیں گے رومن اور ایرانی ایمپائرز کو ان کے ماتحت کر دیا جائے گا اور اگر ایمان نہیں لائیں گے اور کفر کی روش اختیار کریں گے تو انہیں اسی دنیا میں سزا کا سامنا کرنا ہو گا۔ کفار مکہ نے اس پیش گوئی کا مذاق اڑایا اور کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو یہ عذاب لے آیئے۔

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ. وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ. وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ.

اور جب ان (کفار) نے کہا: ”اے اللہ! اگر یہی حق ہے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش فرما دے یا ہم پر دردناک عذاب نازل فرما دے۔“ اللہ انہیں اس حالت میں عذاب دینے والا نہیں تھا جبکہ (اے پیغمبر!) آپ ان میں موجود تھے اور نہ ہی اللہ اس وقت کسی کو عذاب دیتا ہے جب وہ

اس سے توبہ و استغفار کر رہے ہوں۔ لیکن اب وہ انہیں عذاب کیوں نہ دے جبکہ وہ مسجد الحرام کا راستہ روک رہے ہیں اور وہ اس کے جائز متولی بھی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو صرف وہی ہیں جو اہل تقوی ہیں لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (الانفال 8:32-34)

کفار مکہ کے اس مطالبے پر ایک خاص وقت کے بعد اللہ تعالی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم دیا اور اس کے ڈیڑھ سال بعد ہی جنگ بدر کی صورت میں اس عذاب کی پہلی قسط نازل ہوئی جس کے نتیجے میں کفار مکہ کی پوری لیڈر شپ کا صفایا ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں اللہ تعالی نے کسی آسمانی آفت کی صورت میں عذاب نازل فرمانے کی بجائے یہ اہتمام کیا کہ یہ عذاب آپ کے صحابہ کی تلواروں کے ذریعے نافذ ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو ان کفار کی لیڈر شپ عبرت کا نشان بنے کہ جن لوگوں کو وہ حقیر سمجھتے تھے، انہی کے ہاتھوں وہ برباد ہوئے اور دوسرے ان کے عام لوگوں کو اندازہ ہو کہ اللہ تعالی کس کے ساتھ ہے۔ قرآن مجید میں یہی بات واضح فرما دی گئی۔

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ. وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ.

(اے پیغمبر کے صحابہ!) ان سے جنگ کیجیے۔ اللہ انہیں آپ کے ہاتھوں عذاب دے گا اور انہیں رسوا کر دے گا اور آپ لوگوں کی ان کے مقابلے میں مدد فرمائے گا۔ اور اس طرح اہل ایمان کے دلوں کو سکون ملے گا اور ان کے قلوب کی جلن ختم ہو گی۔ اور اللہ جسے چاہے گا، اسے توبہ کی توفیق دے گا اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔۔ (التوبہ 9:14-15)

جنگ بدر کے بعد ہر موقع پر اللہ تعالی نے اپنے پیغمبر اور آپ کے صحابہ کی مدد فرمائی اور ہم دیکھتے ہیں کہ چند برس ہی میں پورے کا پورا عرب اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ 9/631 میں اس عذاب کی آخری قسط نازل ہوئی اور اللہ تعالی نے یہ حکم نازل فرمایا کہ کفار عرب کے لیے سوائے موت یا اسلام کے اور تیسری آپشن موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالی کے اس عذاب کی تفصیلات سورۃ توبہ میں بیان ہوئی ہیں اور وہاں کفار عرب پر فرد جرم عائد کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ توبہ کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں لکھی گئی کہ یہ عذاب کی سورت ہے:

بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ. وَأَذَانٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ فَإِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ. إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ. فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ. وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ.

اعلان بر أت ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکین کے لیے، جن سے آپ لوگوں نے معاہدے کیے تھے۔ تو (اے مشرکین!) تم لوگ ملک میں چار ماہ تک اور چل پھر لو لیکن یہ جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے ہو اور اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمام لوگوں کے لیے حج اکبر کے دن اطلاع عام ہے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے اور منہ پھیرنے والے بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اے نبی! انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خبر سنا دیجیے۔ (اس اعلان کا اطلاق ان لوگوں پر نہیں ہوتا) جن مشرکین سے آپ لوگوں نے معاہدے کیے تھے اور انہوں نے اپنے وعدے کو پورا کرنے میں آپ لوگوں کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ آپ کے خلاف کسی کی مدد کی ہے۔ تو ایسے لوگوں کے ساتھ آپ بھی معاہدے کی مدت تک وعدہ پورا کیجیے کیونکہ اللہ متقین کو پسند فرماتا ہے۔

(اور اے صحابہ!) پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں پائیں، قتل کیجیے، انہیں پکڑیے، گھیریے اور ہر گھات والی جگہ پر ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھیے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دیجیے۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اگر ان مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر آپ لوگوں کے پاس آنا چاہے تو اسے اس وقت تک پناہ دے دیجیے جب تک وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی محفوظ جگہ تک پہنچا دیجیے۔ یہ اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ لاعلم ہیں۔ (التوبۃ 9:1-5)

اگر مشرکین عرب اسلام نہ لاتے تو انہیں موت کی سزا دی جاتی مگر وہ ایمان لے آئے اور اس سزا سے محفوظ رہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں ان میں سے بعض لوگ مرتد ہوئے تو انہیں سزا دے دی گئی۔ عذاب کا یہی کوڑا نہ صرف مشرکین عرب، بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں پر بھی برسا۔ تاہم یہ لوگ چونکہ اصلاً توحید اور پیغمبروں سے وابستہ تھے، اس لیے ان کی سزا موت کی بجائے مغلوبیت مقرر کی گئی۔ یہ سزا بھی اسی سورت میں بیان ہوئی ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ. وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ. اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ. يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ. هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ.

(اے پیغمبر کے صحابہ!) جنگ کیجیے اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر اور اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے اور نہ ہی دین حق کو مانتے ہیں۔ (یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیے جب تک کہ) یہ لوگ اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں اور زیر دست بن کر رہنے کو قبول نہ کر لیں۔ (یہ سزا اس وجہ سے ہے کہ) یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں جو یہ اپنے سے پہلی قوموں کے نظریات سے متاثر ہو کر اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ ان پر اللہ کی مار، یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے علما اور پیروں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور عیسی بن مریم کو بھی۔ انہیں تو صرف اور

صرف ایک خدا کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو شرک یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے پاک ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنے نور (ہدایت) کی تکمیل کے بغیر ماننے والا نہیں ہے اگرچہ ان کفار کو برا لگے۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو سب ادیان پر غالب کر دے اگرچہ ان مشرکین کو برا لگے۔ (التوبہ 9:29-32)

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس سورت کا لب ولہجہ کتنا سخت ہے اور اس میں گویا فرد جرم پڑھ کر سنائی جا رہی ہے اور مختلف گروہوں کی آخرت کی سزا کے ساتھ ساتھ اسی دنیا کی سزا بیان ہو رہی ہے۔ ان گروہوں میں مشرکین عرب، اہل کتاب اور منافقین شامل تھے۔ دوسری طرف اہل ایمان کی جزا بھی اسی سورت میں بیان فرما دی گئی ہے۔ انہیں آخرت میں جنت کے علاوہ اسی دنیا میں غلبے کی بشارت بھی دے دی گئی ہے۔

اللہ تعالی کے اس قانون کو مد نظر رکھا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مختلف مرحلوں اور کامیابی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ کی دعوت میں کیا امور شامل تھے؟

قرآن مجید، احادیث نبوی اور سیرت طیبہ کی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بالکل سادہ تھی۔ اللہ تعالی کی توحید پر ایمان، رسالت محمدی پر ایمان اور آخرت پر ایمان اس دعوت کا بنیادی جزو تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی امور پر خاص توجہ دی گئی تاکہ ایسی امت تیار ہو سکے جو اخلاقی اعتبار سے نہایت بلند ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا ہی میں اہل مکہ پر اللہ تعالی کے قانون دینونت کو واضح فرما دیا تھا۔ گویا آپ کی دعوت تین نکات پر مشتمل تھی:

- ایمان
- اخلاقیات
- قانون دینونت

ہجرت حبشہ کے موقع پر اس دعوت کا خلاصہ اور اس کے پہلے پانچ سال کی تاریخ کو حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں تقریر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے:

اے بادشاہ! ہم ایسی قوم تھے جو جہالت میں مبتلا تھی، ہم بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، رشتے داروں سے تعلق توڑتے تھے، ہمسایوں سے بدسلوکی کرتے تھے اور ہم میں سے طاقت ور کمزور کو کھا رہا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جن کے اعلی نسب، سچائی، امانت اور پاکدامنی سے ہم پہلے آگاہ تھے۔ انہوں نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور سمجھایا کہ ہم صرف ایک اللہ کو مانیں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے، انہیں چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، رشتے داری کا تعلق قائم رکھنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے، حرام کاری اور خونریزی سے باز رہنے کی تلقین کی۔ انہوں نے

ہمیں فحش کاموں میں ملوث ہونے، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاکدامن خواتین پر تہمت لگانے سے منع فرمایا۔ انہوں نے ہمیں یہ تلقین کی ہم صرف اللہ کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ انہوں نے ہمیں نماز، روزہ اور زکوۃ کا حکم دیا۔

(راویہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اس کے بعد حضرت جعفر نے اسلام کے اہم احکام گنوائے اور پھر کہا:) ہم نے ان پیغمبر کو سچا مانا، ان پر ایمان لائے اور ان کے لائے ہوئے دین خداوندی کے معاملے میں ان کی پیروی کی۔ چنانچہ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا۔ جن باتوں کو ان پیغمبر نے حرام بتایا، انہیں حرام مانا اور جن کو حلال بتایا، انہیں حلال سمجھا۔ اس پر ہماری قوم ہم سے ناراض ہو گئی۔ اس نے ہم پر ظلم و ستم کیا اور ہمیں ہمارے دین سے ہٹانے کے لیے فتنے اور سزاؤں سے دوچار کیا تاکہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر بت پرستی کی طرف پلٹ جائیں۔ اور جن گندی چیزوں کو یہ لوگ حلال سمجھتے ہیں، انہیں پھر سے حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر بہت ظلم و ستم کیا، زمین تنگ کر دی اور ہمارے درمیان اور ہمارے دین کے درمیان رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے تو ہم آپ کے ملک میں آ گئے اور دوسروں پر آپ کو ترجیح دیتے ہوئے آپ کی پناہ میں رہنا پسند کیا اور یہ امید کی کہ اے بادشاہ! آپ کے پاس ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔[1]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے یہ بات واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے بنیادی عقائد اور اخلاقی احکام کو ابتدا ہی سے اپنی دعوت کا موضوع بنا لیا تھا۔ اس دور کی نازل شدہ آیات کریمہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ آیات کریمہ دیکھیے:

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا. إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا. وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا. إِلَّا الْمُصَلِّينَ. الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ. وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ. لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ. وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ. وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ. إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ. وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ. إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ. فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ. وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ. وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ. وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ. أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُكْرَمُونَ.

بے شک انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔ اور جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔ اور وہ جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے، جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔ اور جو اپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے۔ (معارج 70:19-35)

اس مکی دور میں کفار مکہ کے جس رویے کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا، وہ یہ تھا:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَهِينٍ. هَمَّازٍ مَشَّاءٍ بِنَمِيمٍ. مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ. عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ. أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ. إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا

قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ.

اور آپ بات نہ سنیے، ہر ایک: بہت قسمیں کھانے والے؛ ذلیل؛ اشارہ باز؛ چغلیاں لگانے والے؛ بھلائی سے روکنے والے؛ حد سے تجاوز کرنے والے؛ حق مارنے والے؛ سنگدل؛ اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل شخص کی۔ یہ کردار اس وجہ سے ہوا کہ وہ مال و اولاد والا ہے۔ جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے، یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں۔ (القلم 68:10-15)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے احکام کا زبردستی کسی پر نفاذ نہیں کیا بلکہ یہ کوشش فرمائی کہ لوگوں کے دل میں ایمان اترتا چلا جائے۔ پھر اسی ایمان سے عمل کی شاخیں پھوٹ نکلیں۔ جب یہ کیفیت ہو گئی تو پھر آہستہ آہستہ شریعت کے احکام نازل ہوتے چلے گئے جن میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج، معاشرت، تجارت، سیاست سبھی کے مفصل احکام تھے۔ اس حقیقت کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یوں بیان کیا ہے:

(قرآن میں) سب سے پہلے جو نازل ہوا، وہ مفصل کی ایک سورت تھی جس میں جنت و جہنم کا ذکر ہے۔ پھر جب لوگ اسلام میں پوری طرح داخل ہو گئے، تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر بالکل شروع ہی میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ شراب نہ پیو، تو لوگ کہتے: "ہم تو کبھی شراب نہیں چھوڑ سکتے۔" اور اگر یہ حکم نازل ہوتا کہ "بدکاری نہ کرو" تو وہ کہتے: "ہم تو بدکاری کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔"[2]

یہی وجہ ہے کہ مکی سورتوں میں اخلاقی برائیوں کا ذکر ہے جن میں بدکاری بھی شامل ہے۔ نیک روحیں ان سے دور جاہلیت میں بھی اجتناب کرتی تھیں اور ان اخلاقی برائیوں کی شناعت کو تعلیم و تربیت کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں راسخ کیا جاتا تھا۔ پھر جب مسلمانوں کی کثیر تعداد ان سے باز رہنے لگی تو ان احکام کو مدنی زندگی میں قانونی شکل دے دی گئی۔

ایمان اور عمل کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں اللہ تعالی کا قانون دینونت نمایاں تھا جس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ قرآن مجید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے "نذیر" کا لفظ بیان ہوا ہے جس کا مطلب ہے کسی خطرے کے بارے میں وارننگ دینے والا۔ مکی زندگی ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو یہ وارننگ دے دی تھی کہ اللہ تعالی نے قریش کی اس قوم کو منتخب کر لیا ہے تاکہ ان کے ذریعے دنیا کی دیگر اقوام پر اتمام حجت کیا جائے۔ اگر ان لوگوں نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو پھر انہیں اللہ تعالی کے عذاب کا منتظر رہنا چاہیے۔ سورۃ الاعراف، سورۃ ہود، سورۃ رعد اور ایسی کوئی سورتوں کا موضوع ہی یہی ہے اور ان سورتوں میں اللہ تعالی نے سابقہ اقوام پر نازل ہونے والے عذاب کی مثالیں بیان کر کر کے اہل مکہ پر یہی حقیقت واضح فرمائی ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ.

اگر یہ لوگ منہ پھیریں تو انہیں کہیے کہ میں آپ لوگوں کو ایسی آسمانی کڑک سے خبردار کر رہا ہوں جو کہ عاد اور ثمود پر نازل ہوئی۔ (الرعد 13:41)

فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ. ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ حَقًّا

عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ.

کیا وہ محض ان (عذاب کے) دنوں کے منتظر ہیں جو ان سے پہلی اقوام پر گزر چکے ہیں۔ آپ فرمایئے کہ اچھا انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہی ہوں۔ پھر ہم اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو نجات دیتے ہیں۔ یہ حق ہم نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے کہ ہم اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں۔(ہود 11:102-103)

کفار مکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے یہ اعتراض کیا کہ اگر آپ سچے ہیں تو اس عذاب کو لے آیئے۔ اس پر اللہ تعالی نے اہل مکہ کو یہ بتا دیا کہ ان پر عذاب اسی صورت میں آئے گا جب اللہ کے پیغمبر اور اہل ایمان ہجرت فرما کر ان کے درمیان سے نکل جائیں گے۔

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ. وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ.

اور جب ان (کفار) نے کہا: ”اے اللہ! اگر یہی حق ہے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش فرما دے یا ہم پر دردناک عذاب نازل فرما دے۔“ اللہ انہیں اس حالت میں عذاب دینے والا نہیں تھا جبکہ (اے پیغمبر!) آپ ان میں موجود تھے اور نہ ہی اللہ اس وقت کسی کو عذاب دیتا ہے جب وہ اس سے توبہ و استغفار کر رہے ہوں۔(الانفال 8:32-33)

مکی زندگی ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح فرما دیا گیا تھا کہ آپ کا مشن محض ایک مقامی مشن نہیں بلکہ گلوبل مشن ہے اور آپ کی نبوت و رسالت کا دائرہ پورے روئے زمین پر محیط ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ.

ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔(سبا 34:28)

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ. إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ. وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ.

یاد دہانی کے بعد ہم یہ بات زبور میں لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔ اس میں عبادت گزار قوم کے لیے ایک بڑی خبر ہے۔(اے پیغمبر!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔(الانبیا 21:105-107)

اللہ تعالی کے قانون دینونت کا دوسرا پہلو یعنی جزا کو بھی مکی زندگی ہی میں واضح کر دیا گیا تھا۔ اہل مکہ کو بتا دیا گیا کہ اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں گے تو انہیں دنیا کے متمدن حصے کی حکمرانی دے دی جائے گی۔ چنانچہ جب کفار مکہ جناب ابو طالب کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھائیں تو آپ نے فرمایا: ”میں ان سے ایک ایسی بات کا مطالبہ کر رہا ہوں جو اگر یہ مان لیں تو تمام عرب ان کے تابع فرمان ہو جائیں گے اور اہل عجم (یعنی روم و ایران) انہیں جزیہ عطا کریں گے۔“[3] یہی بات عتبہ بن

ربیعہ، جو کہ اس دعوت کا مخالف تھا، نے کہی:

میں نے محمد سے جو کلام سنا ہے، اس کی مثال موجود نہیں ہے۔ نہ یہ شعر ہے، نہ جادو، نہ کہانت۔ اے قریش! میری مانیں تو ان صاحب کو اس کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ یہ کلام کسی بڑے انجام تک پہنچنے والا ہے۔ اگر عرب محمد کو کسی مصیبت میں ڈالیں گے تو آپ لوگوں کا مقصد اس کاروائی میں حصہ لیے بغیر ہی پورا ہو جائے گا۔ اگر یہ غالب آ گئے تو ان کی حکومت، آپ لوگوں کی حکومت اور ان کی عزت آپ کی عزت ہو گی۔[4]

رسول اللہ کی دعوت کی مقبولیت کے اسباب

جب ہم انبیا کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی دعوت کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سوائے حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام کے، اکثر انبیا پر ان کی زندگی میں نہایت ہی کم تعداد میں لوگ ایمان لائے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زندگی ہی میں آپ پر لاکھوں لوگ ایمان لائے۔ دعوت کی اس مقبولیت کے اسباب کیا تھے؟ اس موضوع پر بحث آگے بڑھانے سے پہلے ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ عام طور پر لوگ اپنا مذہب تبدیل کیوں کرتے ہیں اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، اس کی وجہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اسی کی روشنی میں دیکھیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی قبولیت یا مخالفت کے اسباب کیا تھے؟ اس کے بعد ہم جائزہ لیں گے کہ آپ کی دعوت کی مقبولیت کا پیٹرن کیا تھا اور اس میں قرآن مجید کا کردار کیا تھا؟

اگر ہم ان لوگوں کے حالات زندگی اور نفسیات کا جائزہ لیں جنہوں نے اپنے پرانے مذہب کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کیا تو اس کی متعدد وجوہات سامنے آتی ہیں۔ بعض لوگ ایک سے زائد وجوہات کی بنیاد پر اپنا مذہب تبدیل کرتے ہیں۔ ان اسباب کا خلاصہ یہ ہے:

- پرانے مذہب سے عدم اطمینان
- مذہبی راہنماؤں کا کردار
- پیش گوئی
- جذباتی واقعہ
- کسی شخصیت سے متاثر ہونا
- تبلیغی سرگرمیاں[5]
- اعلی مقاصد کی تکمیل
- ظلم و تشدد
- خاندان میں کسی شخص کی تبدیلی مذہب

- رعب اور دہشت
- دنیاوی مفادات
- منافقانہ انداز میں دعوت کو قبول کر لینا

یہی اسباب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی قبولیت میں کار فرما رہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے پرانے مذہب سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ان کے ذہنوں میں ایسے سوالات اٹھتے ہیں جن کا جواب انہیں ملتا۔ جب وہ یہ سوال اپنے والدین، بزرگوں اور مذہبی راہنماؤں کے سامنے رکھتے ہیں تو انہیں تسلی بخش جواب دینے کی بجائے جھڑک کر خاموش کروا دیا جاتا ہے۔ جن لوگوں میں یہ عدم اطمینان زیادہ شدت اختیار نہیں کرتا، وہ تو بظاہر اپنے مذہب پر قائم رہتے ہیں اور سوالات دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن جن لوگوں کے ہاں یہ عدم اطمینان شدید ہوتا ہے، وہ کسی ایسے مذہب کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں ان کے سوالات کے جواب مل سکیں۔ جب انہیں ایسا مذہب مل جاتا ہے تو وہ بسا اوقات اپنا گھر بار اور معاشرہ چھوڑ کر اس مذہب میں شامل ہو جاتے ہیں۔

عہد نبوی میں اس کی مثال حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں جن کے والدین ایران کے مجوسی تھے اور انہیں اس مذہب پر اطمینان نہ تھا۔ انہوں نے عیسائیوں کی عبادت کا طریقہ دیکھا تو انہیں یہ بہتر محسوس ہوا اور وہ عیسائی ہو گئے۔ والدین نے انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا تو اپنا وطن چھوڑ کر شام چلے گئے اور وہاں مختلف راہبوں کے ساتھ رہنے لگے اور انہوں نے چرچ کی ملازمت کر لی۔ پھر ایک راہب نے انہیں بتایا کہ ایک پیغمبر کی آمد کی خبر ہماری کتب میں ہے اور میرا اندازہ ہے کہ آپ اب ظاہر ہونے والے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ مدینہ آ گئے اور یہاں مشرف با اسلام ہوئے۔ ایک اور مثال حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں جو بت پرستی سے زمانہ جاہلیت ہی میں بیزار تھے۔ اسی طرح جو صحابہ بالکل ابتدائی زمانے میں اسلام لائے، ان کی اکثریت اپنے معاشرے کی بت پرستی اور اخلاقی بگاڑ سے تنگ تھی۔

دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات کسی مذہب کے علمبردار مذہبی راہنماؤں کا کردار بہت بھیانک ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ دوسروں پر دین کی تمام پابندیوں کو لازم قرار دیتے ہیں مگر خود عمل نہیں کرتے۔ مذہبی اداروں کے فنڈ میں خیانت کرنا، لوگوں کو نفسیاتی ہتھکنڈوں سے اپنا غلام بنانا اور ان کی آمدنی پر خود عیش کرنا، مریدین کا جذباتی اور جنسی استحصال کرنا اور اس نوعیت کے بہت سے امراض ہیں جو ان مذہبی راہنماؤں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز سوچنے سمجھنے والے بعض لوگوں کو نہ صرف ان راہنماؤں سے بلکہ مذہب ہی سے بے گانہ کر دیتی ہے۔ جن لوگوں میں مذہبی جذبہ طاقت ور ہوتا ہے، انہیں اگر کوئی ایسا مذہب ملے، جس کے راہنماؤں کا کردار بلند ہو تو وہ پھر اس کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ سورۃ القلم کی آیات میں اگرچہ کسی متعین شخص کا نام نہیں لیا گیا لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ کی مذہبی لیڈر شپ کا کردار ایسا ہی تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ان سے بد ظن ہو چکے تھے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَهِينٍ. هَمَّازٍ مَشَّاءٍ بِنَمِيمٍ. مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ. عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ. أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ. إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ.

اور آپ بات نہ سنیے، ہر ایک: بہت قسمیں کھانے والے؛ ذلیل؛ اشارہ باز؛ چغلیاں لگانے والے؛ بھلائی سے روکنے والے؛ حد سے تجاوز کرنے والے؛ حق مارنے والے؛ سنگدل؛ اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل شخص کی۔ یہ کردار اس وجہ سے ہوا کہ وہ مال و اولاد والا ہے۔ جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے، یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں۔ (القلم 68:10-15)

تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ بسا اوقات کسی مذہب کی اپنی کتب میں ایک آنے والے پیغمبر کی پیش گوئیاں موجود ہوتی ہیں۔ یہودیوں کے ہاں آج تک "مسیحا" کا انتظار ہو رہا ہے اور انجیل کے اندر بھی ایک آنے والے پیغمبر کی پیش گوئیاں موجود ہیں۔ اسی طرح ہندو مذہب کی کتب میں بھی "کلکی اوتار" کی پیش گوئیاں موجود ہیں۔ جو لوگ اپنے زمانے کی کسی شخصیت پر ان پیش گوئیوں کا اطلاق کرتے ہیں، وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ سیرت نبوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ہاں جو پیش گوئیاں تھیں، اس سے ان کے ساتھ رہنے والے اوس اور خزرج کے قبیلے اچھی طرح واقف تھے۔ جب یہودیوں کی ان سے بحث ہوتی تو وہ آنے والے پیغمبر کی نشانیاں بتا کر کہتے کہ جب وہ آئیں گے تو ہمیں غلبہ نصیب ہو جائے گا۔ اوس اور خزرج کے لوگ یہودیوں کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ان سے ذہنی طور پر متاثر تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اوس اور خزرج تک پہنچی تو انہوں نے یہود کی بیان کردہ نشانیوں کا اطلاق آپ پر کیا اور فوراً ایمان لے آئے۔ موجودہ دور میں بھی بہت سے یہودی اور عیسائی اسی وجہ سے آپ پر ایمان لاتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص مذہب کی جانب مائل نہیں ہوتا لیکن اس کی زندگی میں کوئی ایسا جذباتی واقعہ یا سانحہ رونما ہوتا ہے جو اس کے دل کی دنیا بدل دیتا ہے۔ اس سے وہ مذہب کی طرف مائل ہوتا ہے اور پھر جس مذہب پر اس کا دل جمے، وہ اسے مستقل بنیادوں پر اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی مثال حضرت حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ حضرت حمزہ کو جب علم ہوا کہ ابو جہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر پھاڑ دیا ہے تو وہ خاندانی حمایت کے جذبے سے اٹھے اور انہوں نے ابو جہل سے انتقام لیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: "چچا جان! مجھے خوشی تب ہوتی جب آپ ایمان لے آتے۔" چنانچہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ فوراً ایمان لے آئے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایمان لانے کی پاداش میں اپنی بہن اور بہنوئی رضی اللہ عنہما کو مارا پیٹا اور پھر اسی پر جب انہیں ندامت ہوئی تو ایمان لے آئے۔

پانچویں وجہ یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص کسی اور شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے اور اس کے اخلاق، تقوی اور کردار کا قائل ہوتا ہے۔ جب اس کی جانب سے اسے کوئی دینی دعوت پہنچتی ہے تو وہ اسے فوراً قبول کر لیتا ہے کہ اسے ہرگز یہ توقع نہیں ہوتی کہ یہ شخص بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔

عہد نبوی میں اس کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی قریبی لوگ ہیں جن میں سیدہ خدیجہ، حضرت ابو بکر، علی اور زید بن

حارثہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ انسان میں جو برائیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں، وہ انہیں ہر شخص سے چھپا سکتا ہے مگر اپنی بیوی، بچوں، والدین اور قریبی دوستوں سے انہیں چھپا سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی دعوت انتہائی قریبی لوگوں کے سامنے پیش کی تو سب سے پہلے سیدہ خدیجہ ایمان لائیں کہ انہوں نے شب و روز آپ کے اعلیٰ کردار کا مشاہدہ کیا تھا۔ حضرت ابو بکر بغیر کسی تردد کے ایمان لائے۔ حضرت علی اور زید کی حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچوں کی تھی اور ان دونوں کو آپ نے اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔ یہ بھی بغیر کسی تردد کے ایمان لائے۔ آپ کے والدین اس وقت حیات نہ تھے مگر چچا ابو طالب، جنہوں نے آپ کی پرورش کی تھی، نے اگرچہ کھلے عام اسلام کا اعلان نہیں کیا مگر آپ کی حمایت آخری درجے میں کی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعلق اگرچہ قریش کے سب سے کمزور خاندان سے تھا مگر آپ کو اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح کے قبائل میں انتہائی عزت کا مقام حاصل تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی تیاری کی تو ایک غیر مسلم قبائلی سردار ابن الدغنہ کے قریش کے لیڈروں سے کہا: ''ابو بکر کو اس طرح نہیں نکالا جا سکتا۔ کیا آپ ایسے شخص کو اپنے ہاں سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں جو غربا کو کما کر دیتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، ہر کمزور کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق بات میں سب کی مدد کرتے ہیں۔''[6] یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے، تو ان کی دعوت سے متاثر ہو کر حضرت عثمان، طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم جیسے اکابرین بھی ایمان لے آئے۔

چھٹی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی دین کے ماننے والے مشنری اسپرٹ سے بھرپور ہوتے ہیں۔ وہ بہترین انداز میں اپنی دعوت سب کے سامنے پیش کرتے ہیں، لوگوں کی خدمت کرتے ہیں، ان کے مسائل حل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ آخری درجے میں اعلیٰ ترین کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر لوگ ان کا دین قبول کر لیتے ہیں۔ عہد نبوی میں اس کی مثال سبھی صحابہ کرام ہیں۔ مسلمانوں کے پاس قرآن مجید جیسا معجزہ کن کلام تھا اور نہایت ہی اعلیٰ کردار کے داعی۔ چنانچہ ان کی مشنری اسپرٹ سے متاثر ہو کر بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

ساتویں وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض افراد کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے خدمت خلق، معاشرے میں نیکی پھیلانا وغیرہ۔ انہیں اگر کسی مذہب یا تحریک کے اندر اپنے ان مقاصد کی تکمیل ہوتی نظر آئے تو وہ اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے معاشرے میں آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں لیکن جب یہ کسی مذہب یا تحریک میں شامل ہوتے ہیں تو اس کے سب سے پرجوش حامی بنتے ہیں۔ تقریباً سبھی سابقون الاولون کا معاملہ یہی تھا۔ یہ لوگ اپنے معاشرے کے بگاڑ سے بیزار تھے مگر انہیں اصلاح کا کوئی طریقہ سمجھ نہیں آتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت پیش فرمائی تو یہ اس کی جانب اس طرح لپکے جیسے شمع پر وانے کی طرف لپکتی ہے۔

آٹھویں وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب کسی کمیونٹی پر دینی اسباب کے تحت کے ظلم و تشدد کیا جائے تو اس کے لیے ایک عمومی ہمدردی ان

لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جو ظلم و تشدد کرنے والوں کا حصہ نہ ہوں۔ بسا اوقات خود ظلم کرنے والوں کے دل موم پڑ جاتے ہیں۔ جو لوگ تشدد کے ذریعے کسی دین یا تحریک کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کا یہ اقدام اس دین کے فروغ کا باعث بنے گا۔

ابتدائی صدیوں میں عیسائیت اسی وجہ سے پھیلی تھی۔ یہی معاملہ اسلام کا بھی ہوا۔ جب اہل مکہ نے صحابہ کرام پر ظلم و ستم کی انتہا کی تو اس سے مکہ کے سعید الفطرت لوگوں میں اس مظلوم کمیونٹی کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ شقی القلب لوگوں کو چھوڑ کر سبھی لوگوں کے ہاں یہ جذبات پیدا ہوئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کی لیڈر شپ کی اپنی اولادیں اسلام کی محافظ بنیں۔ ابو جہل کے بیٹے عکرمہ، امیہ بن خلف کے بیٹے صفوان، ولید بن مغیرہ کے بیٹے خالد، عاص بن وائل کے بیٹے عمرو اور ہشام رضی اللہ عنہم نہ صرف اسلام لائے بلکہ ان سب نے دین اسلام کے فروغ کے لیے جان کی بازیاں لگا دیں۔ خود اس لیڈر شپ میں سے حضرت ابوسفیان اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہما ایمان لائے اور ان کی اولادوں میں سیدہ ام حبیبہ اور ابو جندل رضی اللہ عنہما اپنے والدین سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔

نویں وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب کسی ملک، قبیلے یا خاندان کا کوئی بڑا آدمی کسی دین میں داخل ہوتا ہے تو اس کے زیر سایہ رہنے والے دیگر لوگ بھی اس کی مثال پر عمل کرتے ہیں۔ یہ لوگ مقلد ہوتے ہیں اور اس نئے دین کو ماننے کے لیے ان کے لیے یہی وجہ کافی ہوتی ہے کہ فلاں بزرگ یا راہنما نے اس دین کو اختیار کر لیا ہے۔ بعد میں اہل مدینہ کے اندر جب اسلام کی دعوت پھیلنا شروع ہوئی تو یہ عام واقعہ ہوا کہ جب ان کے خاندانوں کے سربراہ مسلمان ہوئے تو ان کے اہل خانہ اور غلاموں نے بھی ساتھ ہی اسلام قبول کر لیا۔ اس کی واضح مثال حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں جو قبیلہ اوس کے سردار تھے اور ان کے ایمان لاتے ہی ان کا اپنا خاندان فوراً اور بقیہ قبیلہ کچھ ہی عرصے میں مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح جب یمن کے ایرانی گورنر باذان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو یمن میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ اسی طرح عمان اور بحرین (مشرقی سعودی عرب) کے حکمرانوں کے ایمان لانے سے ان کی رعایا نے بھی تیزی سے اسلام قبول کر لیا۔

دسویں وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ کسی مذہب کے غلبے اور طاقت سے مرعوب ہو کر اس میں داخل ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ دل سے بھی اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح مکہ کے فوراً بعد سبھی اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا اور آہستہ آہستہ یہ سب پورے خلوص کے ساتھ اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہی معاملہ دیگر عرب قبائل کا ہوا کہ فتح مکہ کے فوراً بعد یہ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے۔ اگرچہ ان کے بعض لوگوں نے وفات نبوی کے بعد ارتداد کی راہ اختیار کی مگر ان کی غالب اکثریت کا دل اسلام پر جم گیا۔

گیارہویں وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ دنیاوی مفادات کے لیے کسی مذہب میں داخل ہوتے ہیں۔ اپنی اصل میں یہ دین دار نہیں

ہوتے بلکہ ان کا مطمح نظر صرف اور صرف دنیاوی مفادات ہوتے ہیں۔ اگر کسی مذہب کو اختیار کرنے سے حکومت مل رہی ہو، کوئی نئی مارکیٹ ہاتھ آ رہی ہو، بہتر کاروباری مواقع مل رہے ہوں، اچھی ملازمت حاصل ہو رہی ہو یا کسی امیر ملک کی شہریت مل رہی ہو تو یہ اس مذہب کو قبول کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ تاہم سابقہ مذہب کی طرح اس نئے مذہب سے بھی ان کی وابستگی محض اوپر اوپر سے ہوتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں یہ اپنے نئے دین کو دل سے بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو اور دنیاوی مفادات کا تقاضہ انہیں اس نئے دین کو چھوڑنے پر مجبور کرے تو یہ اس نئے دین کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص محض دنیاوی مفادات کے لیے ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے مگر اس کی اولاد اس سے بڑھ کر اس نئے دین کے ساتھ مخلص ہوتی ہے۔

مکی دور میں ایسے کسی دنیا پرست شخص کے اسلام قبول کرنے کا امکان نہیں پایا جاتا۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص کیوں کسی ایسے دین کو مانے گا جس پر وہ ایمان نہیں رکھتا اور اسے کوئی مفادات حاصل ہونے کی بجائے الٹا مار کھانا پڑے اور اپنے مال و جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ مدنی دور میں البتہ ایسے لوگوں کا سراغ ملتا ہے اور ان کا ذکر سورۃ الحجرات میں کیا گیا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ بھی پورے خلوص سے دین میں داخل ہو گئے تھے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ۖ وَإِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ.

دیہاتی عربوں نے کہا: ”ہم ایمان لائے۔“ آپ انہیں کہیے کہ آپ لوگ ابھی ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہیں کہ آپ نے اطاعت قبول کی ہے۔ ایمان تو ابھی آپ لوگوں کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اگر آپ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہے تو آپ کے نیک اعمال (کے اجر) میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ یقیناً اللہ غفور و رحیم ہے۔ (الحجرات 49:14)

عہد صحابہ میں اس کی ایک اور مثال غسانی سلطنت کا آخری بادشاہ جبلہ بن ایہم تھا۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سبب یہ مرعوب ہو کر اور اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے اسلام لایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس نے ایک بدو کو تھپڑ مار دیا۔ اس بدو نے حضرت عمر کے سامنے مقدمہ پیش کیا اور آپ نے قصاص کے قانون کے تحت اسے بدلہ لینے کی اجازت دی۔ اس پر جبلہ دلبرداشتہ ہو کر اسلام کو چھوڑ کر رومن ایمپائر میں چلا گیا۔

بارہویں وجہ آخری درجہ کی منافقت ہوتی ہے۔ بعض لوگ اس لیے کسی مذہب میں داخل ہوتے ہیں کہ اس میں رہ کر اس کی جڑیں کاٹیں اور اسے نقصان پہنچائیں۔ یہ لوگ کسی اور مذہب یا تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں اور نئے مذہب کو یہ ختم کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے کسی شخص کا سراغ مکی دور میں نہیں ملتا کیونکہ کسی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اسلام میں داخل ہو کر مخالفت کرے جبکہ ایسا کرنے کی صورت میں اسے ظلم و جبر کا سامنا کرنا پڑے۔ مدنی دور میں ایسے منافقین موجود تھے جن کا سرخیل عبد اللہ بن ابی تھا مگر اس نے بھی مفادات کے ٹکراؤ کے تحت اسلام کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کی۔ عہد صحابہ میں اس کی مثال عبد اللہ بن سبا تھا۔ یہ اصلاً یہودی تھا اور

اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے اس میں داخل ہوا۔ اس نے عجیب و غریب نظریات مسلمانوں میں پھیلائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت اٹھائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لے کر ان کے بارے میں جھوٹا پراپیگنڈا کیا۔ اس تحریک کی تفصیلات آپ میری کتاب ''عہد صحابہ اور جدید ذہن کے شبہات'' میں دیکھ سکتے ہیں۔

دعوت اسلام کی مقبولیت میں قرآن مجید کا کردار

اسلام کی دعوت کی مقبولیت میں قرآن مجید نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ فصاحت و بلاغت اور ادبی عرب کا ایسا لازوال معجزہ ہے جس کی نظیر کلام عرب میں نہیں ملتی۔ عربوں کے ہاں قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اس درجے کی مانی ہوئی چیز ہے کہ غیر مسلم عرب بھی اس کا انکار نہیں کرتے اور اسے عربی ادب کا ''شہ پارہ (Masterpiece)'' سمجھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم قرآن مجید کے عربوں کی نفسیات پر اثرات کو بیان کریں، بہتر ہو گا کہ فصاحت و بلاغت کی کچھ تفصیل بیان کر دیں تاکہ جو لوگ اس تصور سے واقف نہیں ہیں، انہیں اس کا اندازہ ہو جائے۔

فصاحت و بلاغت کی وضاحت

آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب آپ کسی خوبصورت فقرے یا شعر کو سنتے یا پڑھتے ہیں تو اس سے ایک خاص قسم کا لطف دل ہی دل میں محسوس ہوتا ہے۔ بعض لوگ برجستہ اور برمحل فقروں یا اشعار پر پھڑک اٹھتے ہیں، بعض فرط جذبات سے رو دیتے ہیں اور بعض ہنس پڑتے ہیں۔ اچھے فقرے اور اشعار انسان کا موڈ بدل دیتے ہیں اور یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ ہنستے کو رلا دیں اور روتے کو ہنسا دیں۔ شاعری کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ انسان کے دل کے تاروں کو چھو سکتی ہے۔ خاص کر اگر اچھی شاعری کو گا کر پیش کیا جائے تو انسان اسے سن کر جھوم اٹھتا ہے اور کبھی اس کے دل کی دنیا بھی اس سے بدل جاتی ہے۔ یہی معاملہ نثر کا ہے۔ اچھی نثر، خواہ تحریری ہو یا زبانی، شاعری کی طرح جذبات پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ انسانی عقل کو اپیل بھی کر سکتی ہے۔ اس کے ذریعے موثر انداز میں دلائل پیش کر کے مخاطب کو قائل بھی کیا جا سکتا ہے، حسب ضرورت ہر طرح کے جذبات کو بھڑکایا بھی جا سکتا ہے اور ٹھنڈا بھی کیا جا سکتا ہے۔ زخموں کے کھرنڈ کو کھرچا بھی جا سکتا ہے اور ان پر مرہم بھی لگایا جا سکتا ہے۔ شاعری اور نثر کی اس صلاحیت کی وجہ سے اس کا شمار فنون لطیفہ (Fine Arts) میں کیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ مصوری، مجسمہ سازی، آرکی ٹیکچر، موسیقی اور دیگر فائن آرٹس کا ہے۔

شاعری اور نثر کی یہ وہ صلاحیت ہے جس کی وجہ سے سبھی مذاہب اور تحریکوں کے داعی حضرات نے انہیں استعمال کیا ہے۔ شاعری اور نثر میں اثر انگیزی کی صلاحیت جتنی زیادہ ہو گی، وہ اتنی ہی فصیح و بلیغ سمجھی جائے گی۔ شاعری اور نثر کو مجموعی طور پر ہم یہاں ''کلام'' کے لفظ سے تعبیر کریں گے۔ علم بلاغت کے ماہرین نے اس فن کے کچھ اصول بیان کیے ہیں اور جو کلام ان اصولوں کی پابندی پر مبنی ہو، فصیح

و بلیغ کلام کہلاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ اصول صرف عربی زبان تک ہی محدود نہیں بلکہ دنیا کی سبھی زبانوں میں اعلیٰ زبان اور معیار سے گری ہوئی زبان کا تصور موجود ہے۔

فصاحت کا مطلب ہے، کلام کا واضح اور قابل فہم ہونا۔ فصیح کلام ایسے کلام کو کہتے ہیں جس میں یہ خصوصیات پائی جائیں:

- کلام میں گرامر کے مروجہ اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو۔
- کلام مشکل سے بولے جانے والے اور کانوں کو بھلے نہ لگنے والے الفاظ سے پاک ہو۔
- کلام میں الفاظ کو اس طرح سے استعمال نہ کیا جائے کہ اسے بولنا یا سننا مشکل ہو۔ مثلاً یہ عربی شعر فصیح نہیں ہے، اسے تیزی سے پڑھنے کی کوشش کر کے آپ اس کا تجربہ آپ خود کر سکتے ہیں: و قبْرُ حَربٍ بِمَكَانٍ قَفْرُ: و لَيسَ قُربَ قبْرِ حَربٍ قبْرُ۔ (جنگ کی قبر صحرا میں ہے۔ جنگ کی قبر کے پاس جانا بذات خود قبر (موت) نہیں ہے۔)
- کلام میں الفاظ کی ترتیب مناسب ہو۔ اگر ترتیب درست نہ ہو گی تو اس سے مراد واضح نہ ہو گی۔ جیسے اگر یہ کہا جائے کہ 'اگر ٹوپی تمہارے سر پر پوری نہ آئے تو اسے چھوٹا ہونا چاہیے۔' اس جملے میں یہ واضح نہیں ہے کہ چھوٹا کس چیز کو ہونا چاہیے: ٹوپی کو یا سر کو؟ صحیح ترتیب یہ ہو گی: 'ٹوپی کو چھوٹا ہونا چاہیے اگر یہ تمہارے سر پر پوری نہ آئے۔'
- الفاظ مناسب استعمال کیے جائیں جو معنی کو پوری طرح واضح کرتے ہوں۔ الفاظ ایسے ہونے چاہییں جو اس زبان کے ادیب اور شاعر عام استعمال کرتے ہوں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشکل الفاظ استعمال کرنا زبان کی خوبی نہیں بلکہ خامی ہے۔
- زبان میں بے جا تکرار یا الفاظ کا ضرورت سے زیادہ استعمال نہ ہو۔

انگریزی میں فصاحت کی انہی خصوصیات کو 7Cs یعنی completeness, conciseness, correctness, coherence, concreteness, clarity, courteousness سے بیان کیا جاتا ہے۔ اچھا کلام اسی کو سمجھا جاتا ہے جو مکمل، مختصر، درست، مربوط، مستند اور واضح ہو اور اس میں مناسب لب و لہجہ استعمال کیا گیا ہو۔

بلاغت کا لغوی معنی ہے 'مناسب ہونا'۔ بلیغ کلام، ایسے کلام کو کہتے ہیں جو کہ فصیح ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا ہو کہ اس میں مخاطبین کی رعایت سے مناسب الفاظ استعمال کیے گئے ہوں تاکہ درکار نتائج پیدا ہو سکیں۔ مثلاً اگر کسی اشتہار کا مقصد یہ ہو کہ لوگ اس میں بیان کردہ پراڈکٹ کو خریدیں اور لوگ اس اشتہار کو پڑھ کر یا دیکھ کر بور ہونے لگیں تو اسے بلیغ نہیں کہا جائے گا۔ بلاغت ایسا آرٹ ہے جسے سیکھنے کے لئے طالب علم میں جمالیاتی حس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس آرٹ کو سیکھ کر ایک طالب علم اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ مناسب اور غیر مناسب میں تمیز کر سکے۔ بلاغت پینٹنگ کی طرح ہے۔ جیسے کوئی آرٹسٹ رنگوں کی مناسب آمیزش کر کے اپنے مخاطبین کی جمالیاتی اور عقلی حسوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے، بالکل ویسے ہی ایک بلیغ ادیب الفاظ، جملوں، تراکیب، محاوروں، مثالوں،

تشبیہات، استعاروں وغیرہ کا مناسب استعمال کر کے مخاطب کے جذبات و احساسات کے تاروں کو چھیڑ سکتا ہے۔ ایک بلیغ ادیب اپنے خیالات کو مناسب الفاظ، جملوں اور اسالیب میں اس طریقے سے پیش کرتا ہے کہ مخاطب کی جمالیاتی، عقلی اور جذباتی حالت متاثر ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ ایک لفظ، مرکب یا جملہ ایک مقام پر اچھے نتائج مرتب کرے مگر وہی لفظ یا جملہ دوسرے مقام پر اچھے نتائج مرتب نہ کر سکے۔ جیسے خوشی کی تقریب میں ایک مزاحیہ نظم زبردست قہقہے بکھیر سکتی ہے مگر جنازے کی تقریب کے لئے وہی نظم بالکل ہی غیر مناسب ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بلیغ ادیب کو الفاظ، محاوروں اور جملوں کا انتخاب کرتے ہوئے سامعین کی ذہنی سطح، جذبات، رجحانات، جگہ اور زیر بحث موضوع جیسے پہلوؤں کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ بلاغت کا تعلق صرف الفاظ کے مناسب استعمال ہی سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ کلام کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے جن میں الفاظ، معانی، اسالیب، جگہ، موقع و محل اور مخاطبین کی نفسیات سبھی شامل ہیں۔

اسلوب بیان

بات کو کہنے کے اسلوب کا فصاحت و بلاغت سے گہرا تعلق ہے۔ اسلوب (جمع اسالیب) کا مطلب ہے انداز یا اسٹائل۔ زبان کے اسلوب سے مراد کسی بات کو بیان کرنے کا انداز ہوتا ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں جن میں الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب، جملوں کی ترکیب، اور اعلی احساسات کو بیان کرنے کے طریقے شامل ہیں۔ اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ اگلے اسباق میں پڑھیں گے۔ اسلوب کی تین اقسام ہیں: علمی اسلوب، ادبی اسلوب اور خطابی اسلوب۔

علمی اسلوب کسی بات کو بیان کرنے کا سادہ انداز ہوتا ہے جس میں مخاطبین کی عقل کو ہدف بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر اس اسلوب میں شاعروں جیسا تخیل نہیں پایا جاتا ہے۔ علمی مباحث اور ان کے دلائل کو واضح الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس اسلوب کی سب سے اہم خصوصیت کلام کا 'واضح ہونا' ہے۔ زبان سادہ استعمال کی جاتی ہے۔ الفاظ ایسے استعمال کیے جاتے ہیں جو سامعین کے لئے اجنبی نہ ہوں تاکہ انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ زیادہ تر نصابی کتب اس اسلوب کی مثال ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں کے اسلوب کو ادبی اسلوب کہا جاتا ہے۔ اس کی اہم ترین خصوصیت 'تخیل' اور 'فنٹیسی' ہے۔ نت نئے خیالات ایجاد کیے جاتے ہیں اور انہیں تمثیلی اور مجازی انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور نازک خیالات و احساسات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر یا ادیب کے سوچنے کا انداز سائنسدانوں جیسا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک سائنسدان کے نزدیک 'گلاب کا پھول' محض پودے کا ایک عضو ہے جو کہ پودے کی نسل کشی میں کام آتا ہے۔ اس کے برعکس ایک ادیب کے لئے یہ محبت کی علامت ہے۔ اسی طرح سائنسدان کے خیال میں 'چاند' آسمان پر محض ایک سیارہ ہے جبکہ شاعر کے لئے یہ محبوب کی خوبصورتی بیان کرنے کا ایک انداز ہے۔ سائنسدان کے خیال میں 'آگ' ایسی چیز ہے جو جلا دیتی ہے جبکہ شاعر اسے نفرت، غصے اور حسد کے مجازی معنی میں استعمال کرتا

ہے۔

خطابی اسلوب خطیبوں اور شعلہ بیان مقررین کے انداز بیان کو کہتے ہیں جس میں وہ علمی و ادبی اسالیب کی خصوصیات اکٹھی کر دیتے ہیں۔ وہ الفاظ، معانی، دلائل، عقل، اور جذبات کی طاقت کو استعمال کر کے اپنے سامعین پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی خصوصیت 'تاثیر' ہے۔ اگر خطیب سامعین کے ذہنوں میں تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کا کلام موثر ہے ورنہ نہیں۔ کلام کی اس تاثیر کا انحصار خطیب کے مقام و مرتبے، انداز بیان، حلیے، دلائل کی قوت، آواز کے زیر و بم اور باڈی لینگوج پر ہوتا ہے۔ خطیب عام طور پر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس میں وہ سامعین کو قائل کر سکیں۔ وہ مختلف انداز میں اپنی بات کو پیش کرتے ہیں۔ کبھی وہ سوال کرتے ہیں، کبھی کسی کو پکارتے ہیں، کبھی دلائل دیتے ہیں، اور کبھی پل بھر کے لئے خاموشی بھی اختیار کرتے ہیں۔ ان کی یہ خاموشی بھی سامعین پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس سب کا مقصد سامعین کو کسی مقصد کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے۔

جو قارئین فن فصاحت و بلاغت میں دلچسپی رکھتے ہوں، وہ اس کی تفصیل کا مطالعہ "قرآنی عربی پروگرام" کے ماڈیول AR05 میں کر سکتے ہیں۔

دور جاہلیت کے عربوں کے ہاں چونکہ تحریر کا رواج بہت ہی کم تھا اور دیگر فنون لطیفہ بھی بالکل ابتدائی حالت میں تھے، اس وجہ سے ان کے ہاں زبانی شاعری اور زبانی نثر یعنی خطابت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کی تفصیل آپ زمانہ قبل از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کے ہاں شاعر اور خطیب کو غیر معمولی اسٹیٹس حاصل تھا۔ شاعروں اور خطیبوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا بلکہ فصیح ترین شعر کہنے پر بسا اوقات لوگ شاعر کے آگے سجدے میں گر جاتے۔ جب کسی قبیلے میں اچھا شاعر پیدا ہوتا تو لوگ مبارکباد دینے آتے۔ شاعر اور خطیب کو قبیلے کا نمائندہ (Spokesperson) سمجھا جاتا۔ قرب و جوار کے بادشاہوں کے ہاں سفیر کے طور پر بہترین شعرا اور خطبا کا انتخاب کیا جاتا۔ امن کے زمانے میں لوگ شاعری اور خطابت سے محظوظ ہوتے اور جنگ کے زمانے میں یہی شاعر اور خطیب جنگی جنون کو بھڑکا دیتے۔ تجارتی میلوں میں شاعری اور خطابت کے مقابلے ہوتے اور جیتنے والوں کو پورے عرب میں غیر معمولی اسٹیٹس حاصل ہو جاتا۔ اس کی نظم کو خانہ کعبہ کے ساتھ لٹکایا جاتا اور پورے عرب میں اس کی عزت کی جاتی۔

فصاحت و بلاغت کا معجزہ

اللہ تعالی نے قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کا ایسا معجزہ بنا دیا کہ اس کی کوئی مثال کلام عرب میں نہیں ملتی۔ یہ نہ محض شاعری ہے اور نہ محض نثر۔ اس کلام میں شاعری کی طرح قافیہ کا خیال رکھا گیا ہے مگر اس کی آیات میں شاعری کی طرح وزن کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اس کی آیات کا تناسب ایسا ہے کہ اس کی تلاوت سننے پر انسان کی سننے کی جمالیاتی حس کی غیر معمولی تسکین ہوتی ہے اور Acoustics کے ماہرین اس کلام کے تناسب پر حیران رہ جاتے ہیں۔ خوبصورت شاعری سننے پر انسان کی جو کیفیت ہوتی ہے، وہ قرآن کو سننے پر آخری درجے میں پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگرچہ یہ کلام نثر ہے مگر اس میں عقلی استدلال کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تخیل

اس حسن تناسب کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ اس کی مثال کلام عرب میں نہیں ملتی۔

جب عربوں نے ایسا کلام سنا، جس کے درجے کی کوئی چیز انہوں نے پہلے نہ سن رکھی تھی تو ان کے دل کی دنیا بدل گئی اور وہ ایمان لانے لگے۔ عام لوگوں کا کیا ذکر، عربوں کے اس وقت کے جو چوٹی کے شاعر اور خطیب تھے، وہ ایمان لانے لگے۔ ٹاپ شعرا میں سب سے نمایاں حضرت لبید بن ربیعہ، حسان بن ثابت اور کعب بن زہیر رضی اللہ عنہم تھے۔ لبید کا شمار "معلقات" کے شاعروں میں ہوتا ہے اور معلقات کے شاعر وہ ہیں جو عرب میں آل ٹائم ٹاپ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے قرآن سن کر شاعری چھوڑ دی اور جب کسی نے شاعری کی فرمائش کی تو کہا: "کیا قرآن کے بعد کسی شاعری کی گنجائش ہے؟" چوٹی کے خطیبوں میں اکثم بن صیفی اور عمرو بن معدی کرب نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے قبائل کے نمائندہ شاعر اور خطیب مسلمان ہوئے۔ معلقات کے مشہور شاعر الاعشی نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کیا مگر کفار نے اسے اونٹوں کا لالچ دے کر ایسا کرنے سے روک دیا۔

یہ تو وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جو مسلمان نہیں ہوئے، ان میں سب سے نمایاں شخصیت ولید بن مغیرہ کی تھی جس کی اسلام دشمنی معروف ہے۔ یہ شخص عربوں میں شاعری کا بہترین نقاد سمجھا جاتا تھا، اس نے قرآن پر جو تبصرہ کیا، وہ آپ یہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں:

ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ولید بن مغیرہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ نے اسے قرآن پڑھ کر سنایا۔ مغیرہ گویا مسحور سا ہو کر رہ گیا۔ یہ بات جب ابو جہل کو معلوم ہوئی تو وہ (ولید سے) کہنے لگا:

ابو جہل: چچا! آپ کی قوم (بنو مخزوم جس سے ان دونوں کا تعلق تھا) سوچ رہی ہے کہ آپ کے لیے مال اکٹھا کیا جائے۔

ولید: وہ کس لیے؟

ابو جہل: تاکہ آپ کو دیں کیونکہ آپ نے محمد سے تعرض کرنا چھوڑ دیا ہے حالانکہ اس سے پہلے ایسا نہیں تھا۔

ولید: قریش جانتے ہیں کہ میں ان میں سب سے زیادہ مالدار ہوں۔

ابو جہل: اس بات کے بارے میں کچھ کہیے جو آپ کی قوم تک پہنچی ہے حالانکہ آپ محمد کے شدید مخالف تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔

ولید: میں کیا کہوں۔ اللہ کی قسم! کوئی شخص مجھ سے بڑھ کر شاعری کو نہیں جانتا، نہ ہی کوئی مجھ سے بڑھ کر رجز، قصیدے اور جنات کے اشعار سے واقف ہے۔ اللہ کی قسم! اس چیز (قرآن) سے ان میں سے کوئی چیز مشابہت نہیں رکھتی۔ واللہ! اس کلام میں تو جو مٹھاس ہے، اور جو رونق و حسن ہے، اس کا جواب نہیں۔ اس کا شروع کا حصہ پھل دار ہے اور بعد کا کا حصہ بارش کی طرح برستا ہے۔ اس کے اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کے کیا کہنے۔"

ابو جہل: آپ جو کہہ رہے ہیں، اس سے آپ کی قوم خوش نہیں ہو گی۔"

ولید: مجھے چھوڑو، میں کچھ غور کروں۔ (پھر اس نے غور کر کے کہا:) یہ کلام جادو ہے اور سننے والے پر بہت اثر کرتا ہے۔

(ابن عباس کہتے ہیں) کہ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: "مجھے چھوڑو اور اسے جسے میں نے اکیلا بنایا ہے۔"[7]

صرف ولید ہی کیا، قریش کے دیگر لیڈروں کو بھی قرآن سننے کا ایسا شوق تھا کہ وہ بھی چھپ چھپ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سنا کرتے تھے جو آپ تہجد کے وقت کیا کرتے تھے۔ ایک بار ابو جہل، اخنس بن شریق اور ابو سفیان (رضی اللہ عنہ) ایسی ہی ایک محفل میں آئے اور دبک کر بیٹھے رہے۔ جب واپس ہوئے تو آمنا سامنا ہو گیا۔ اب یہ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ آئندہ ایسا نہ کرنا ورنہ لوگ گمراہ ہو جائیں گے۔ اگلی صبح پھر ایسا ہی ہوا۔ تین دن تک یہی ہوتا رہا اور یہ ایک دوسرے کو ملامت کرتے رہے۔[8]

ایک معروف دشمن نضر بن حارث نے قرآن کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے طریقہ یہ نکالا کہ حیرہ سے رستم و اسفندیار کی کہانیوں کی ایک کتاب لے آیا اور لوگوں کو اکٹھا کر کے سنانے لگا لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ چنانچہ اسے کہنے پر مجبور ہونا پڑا:

> جس مصیبت میں تم مبتلا ہو، اس سے نجات کی کوئی صورت تمہیں نہیں سوجھتی!!! یہ وہی محمد ہیں، جو کل تک جب جوان تھے، تو سب کی آنکھوں کے نور تھے۔ آپ میں سے سب سے زیادہ سچی بات کرنے والے بھی یہی تھے اور سب سے زیادہ دیانتدار اور امانت دار بھی یہی تھے۔ آج جب ان کی کنپٹی کے بال سفید ہو رہے ہیں تو یہ آپ کے پاس ایک پیغام لائے ہیں جو آپ لوگوں نے سن لیا ہے۔ آج آپ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ جادوگر ہے۔ واللہ، وہ جادوگر نہیں ہے۔ ہم نے جادوگر بھی دیکھے ہیں اور ان کی گرہیں لگا کر ان میں پھونک مارنے کے انداز بھی ہمیں معلوم ہیں۔ ہم نے کاہن بھی دیکھے ہیں اور ان کے مسجع مقفی جملے (وہ جملے جو ہم قافیہ ہوں) بھی سنے ہیں۔ آج آپ لوگ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہے۔ نہیں واللہ وہ شاعر بھی نہیں ہے۔ ہمیں شعر کی حقیقت معلوم ہے اور اس کی ساری صنفوں سے بھی ہم باخبر ہیں۔ آج آپ کہتے ہیں کہ وہ مجنون ہیں۔ نہیں واللہ! وہ مجنون نہیں ہیں۔ ہم جنون کی حالت سے بھی بے خبر نہیں ہیں اور اس حالت کی وسوسہ اندازیوں اور خلط ملط سے بھی ہم واقف ہیں۔ گروہ قریش! اپنی حالت پر غور کریں، آپ کو بلاشبہ بہت مشکل صورتحال سامنا ہے۔[9]

قرآن اور جذبات

جب عرب کے چوٹی کے شعرا اور خطبا کے علاوہ اسلام کے بدترین دشمنوں پر قرآن کے اثرات کا یہ عالم تھا، تو پھر عام آدمی کے ذہن پر قرآن کے جو اثرات مرتب ہوتے ہوں گے، اس کا ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ابن الدغنہ والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے لان میں ایک مسجد بنا رکھی تھی اور یہاں آپ نماز پڑھتے تھے اور قرآن مجید کی بلند آواز میں تلاوت کیا کرتے تھے۔ آپ کی آواز سن کر مشرکین کی خواتین اور بچے وہاں اکٹھے ہو جاتے اور قرآن سنا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر کے آنسو تلاوت کرتے وقت جاری ہو جاتے اور ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مشرکین کی خواتین اور بچوں کا معاملہ بھی یہی ہوتا ہو گا۔ مشرکین نے ابن الدغنہ سے شکایت کرتے ہوئے کہا: "ہمیں خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہماری خواتین اور اولاد کسی فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔"[10]

کفار مکہ کے لیے ایک نئی مصیبت یہ پیدا ہو گئی کہ اللہ تعالی نے کفار عرب کو یہ چیلنج دے دیا:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ. فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ.

(اے اہل عرب!) اگر آپ لوگوں کو اس کلام (کے کلام اللہ ہونے) میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو پھر اس جیسی ایک سورت ہی لے آیئے اور اس کے لیے اللہ کے سوا اپنے اور تمام حمایتیوں کو بھی بلا لیجیے، اگر آپ واقعی اپنے خیال میں سچے ہیں؟ تو اگر آپ ایسا نہ کر پائیں اور ہر گز نہ کر پائیں گے تو پھر اس آگ سے خبر دار رہیے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جو انکار کرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (البقرۃ2:23-24)

عربوں کے ہاں اعلی درجے کے شاعر اور خطیب موجود تھے اور اگر ان کے لیے ممکن ہوتا تو جس درجے کی مخالفت وہ کر رہے تھے، وہ ضرور اس چیلنج کو قبول کرتے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور ان کے ٹاپ شعرا اور خطبا نے بھی عاجزی کا اظہار کر دیا۔ اب ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ظلم و تشدد یا لالچ کے ذریعے لوگوں کو اس دین کو قبول کرنے سے باز رکھیں۔

قرآن اور عقل

ایسا نہیں تھا کہ قرآن مجید کے ذریعے اہل عرب کے ذہنوں کو ہپناٹائز کر کے انہیں اسلام کی طرف مائل کیا جاتا ہو۔ قرآن کی اصل قوت، اس کی فصاحت و بلاغت میں نہیں بلکہ اس کی دعوت کی سادگی میں تھی۔ قرآن بار بار جذبات کے ساتھ ساتھ عقل کو اپیل کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس میں غور و فکر کرنے، عقل استعمال کرنے اور سابقہ اقوام کی تاریخ پر غور کرنے کی دعوت ہے۔ یہ اہل عرب کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات نہایت ہی معقولیت، سادگی اور بے تکلفی سے دیتا ہے۔ کوئی بھی ایسا شخص جو اپنی عقل کو استعمال کرتا ہوں اور تعصب سے پاک ہو، قرآن کے استدلال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں ہم چند مثالیں پیش کر رہے ہیں:

عرب کے منکرین آخرت کا سب سے بڑا سوال یہی تھا کہ گلی سڑی ہڈیوں کو کیسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔

قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ. قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ.

اس نے کہا: "جب ہڈیاں گل سڑ جائیں گی تو انہیں کون زندہ کرے گا؟" آپ کہیے: "انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ زندگی دی تھی اور وہ ہر قسم کی تخلیق کو جانتا ہے۔" (یس36:78-79)

یہ سوال کیا گیا کہ اللہ تعالی نے ایک انسان ہی پر اپنا کلام نازل کیوں کیا ہے؟ زیادہ بہتر ہوتا کہ کوئی فرشتہ نازل ہوتا۔ اس کا جواب دیکھیے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا. قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا.

جب ان لوگوں کے پاس ہدایت آئی تو ان کے ایمان لانے میں اس کے سوا اور کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنی کہ وہ کہنے لگے: "کیا اللہ نے محض ایک

انسان کو رسول بنا دیا ہے؟" آپ (جواب میں) فرمایئے: "اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے ایک فرشتہ بطور رسول نازل کر دیتے۔ (بنی اسرائیل 17:94-95)

قرآن مجید میں اہل عرب کو بار بار یہ تلقین فرمائی کہ وہ اس کائنات کی نشانیوں میں غور و فکر کریں اور اپنی عقل کو استعمال کریں۔ اسی سے انہیں صحیح راستہ مل جائے گا۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ.

یقیناً آسمان و زمین کی تخلیق، رات اور دن کی تبدیلیوں، سمندر میں لوگوں کے فائدے کے لیے چلنے والے جہاز، آسمان سے جو پانی اللہ نے اتارا تاکہ زمین کو اس کے بنجر ہونے کے بعد زندگی دے اور اس میں ہر طرح کے مویشی پھیلائے، ہواؤں کی گردش، آسمان اور زمین کے درمیان معلق بادل۔۔۔ ان سب میں ایسے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔ (البقرۃ 2:164)

قرآن مجید کے معجزانہ کلام اور اس کی جانب سے عقل اور جذبات کو اپیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل مکہ کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا، جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو۔ جو لوگ ایمان نہیں بھی لائے، وہ بھی قرآن کی دعوت سے متاثر ضرور ہوئے۔

دعوت اسلام کی مخالفت

جہاں اسلام کی دعوت تیزی سے پھیل رہی تھی، وہاں اس کی مخالفت میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی۔ اس سیکشن میں ہم یہ دیکھیں گے کہ اس مخالفت کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین اسلام نے کیا ہتھکنڈے استعمال کیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں نے ان کا جواب کیا دیا۔

مخالفت کے اسباب

جیسا کہ بعض لوگ مختلف وجوہات کی بنیاد پر کسی نئے دین کو اختیار کرتے ہیں، بالکل اسی طرح بعض لوگ پرانے دین پر نہ صرف جمے رہتے ہیں اور بلکہ نئے دین کی شدید مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نفسیات کا جائزہ لیا جائے تو اس کی یہ وجوہات سامنے آتی ہیں:

- پرانے مذہب پر اطمینان اور اس سے جذباتی وابستگی
- اندھی تقلید
- پرانے مذہب اور اس کی بنیاد پر قائم معاشرے میں انتشار (Disintegration) کا خطرہ

- نئے مذہب کے ماننے والوں سے بغاوت کا خطرہ
- قبائلی اور دیگر نوعیت کا تعصب
- دنیاوی مفادات کا ٹکراؤ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں بھی یہی وجوہات کار فرما تھیں۔ قریش میں بعض لوگ ایسے تھے جنہیں بت پرستی سے لگاؤ تھا کیونکہ وہ اپنے آباؤ اجداد کو ایسا کرتے دیکھتے آئے تھے۔ اس مخالفت کی سب سے بڑی وجہ اندھی تقلید تھی۔ اہل مکہ کے سامنے جب بت پرستی کی مذمت کی جاتی تو وہ کہتے: ”ہمارے آباؤ اجداد ایسا کرتے آئے ہیں، کیا وہ لوگ بے وقوف تھے؟“ وہ اس بات کو اپنے بزرگوں کی شان میں گستاخی سمجھتے تھے کہ ان کے قائم کردہ طور طریقوں پر تنقید کی جائے اور انہیں غلط قرار دیا جائے۔ قرآن مجید میں ان کی یہ ذہنیت اس طرح بیان ہوئی ہے:

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ.

یقیناً ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم تو انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ (الزخرف 43:23)

بعض اہل مکہ کو یہ خدشہ تھا کہ اگر اسلام کو پھلنے پھولنے کی اجازت دی گئی تو اس سے ان کے معاشرے میں انتشار پیدا ہو گا اور جو اتحاد قریش میں اب تک برقرار ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ جب یہ لوگ جناب ابو طالب کے پاس شکایت لے کر آئے تو اس میں انہوں نے یہ بات پیش کی کہ اس دین کی وجہ سے قوم کا شیرازہ منتشر ہو رہا ہے۔[11] اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کو چھوڑ دیں تو ہم انہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی حکمران نئے مذہب کے ماننے والوں سے بغاوت کا خطرہ محسوس کرتا ہے، خواہ یہ حقیقی ہو یا نہ ہو اور اس وجہ سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور اس مذہب کے ماننے والوں پر پابندیاں لگاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر فرعون کی سختی کی وجہ یہی تھی۔ ممکن ہے کہ قریش کی لیڈر شپ نے بھی ایسا ہی خطرہ محسوس کیا ہو۔

قبائلی تعصب بھی مخالفت کا ایک اہم ترین سبب تھا۔ قریش کے مختلف خاندان ایک دوسرے پر فخر جتلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ایسی ہی چپقلش بنو عبد مناف (جس میں بنو ہاشم اور بنو امیہ دونوں شامل تھے) اور بنو مخزوم کے درمیان تھی۔ ابو جہل کا تعلق بنو مخزوم سے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنو عبد مناف سے۔ ابو جہل نے آپ کے اعلان نبوت سے یہ سمجھا کہ یہ بنو عبد مناف کی سازش ہے کہ وہ ہم پر فخر جتلانے کے لیے نبوت کا اعلان کر رہے ہیں اور اس طرح قبائلی تعصب کی وجہ سے وہ اسلام کا شدید مخالف بنا۔ سیرت ابن ہشام میں ہمیں ابو جہل کا یہ قول ملتا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا (بنو مخزوم) اور بنو عبد مناف کا جھگڑا اس بات پر تھا کہ قوم کا سردار کون ہے۔ اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے انہوں

نے اپنے غربا کو کھانا کھلایا اور ہم نے بھی ایسا ہی کیا۔ انہوں نے (کمزوروں کے) بوجھ اٹھائے اور ہم نے بھی اٹھائے۔ انہوں نے لوگوں کو مال دیا اور ہم نے بھی دیا۔ جب ہم مقابلے کے دو گھوڑوں کی طرح ہو گئے تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم میں سے ایک شخص کو نبوت ملی ہے اور اس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اب ہم یہ دعوی کہاں سے کریں؟ واللہ! ہم تو اس پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔[12]

دنیاوی مفادات کا ٹکراؤ بھی اکثر اوقات ایک مذہب کی مخالفت پر لوگوں کو مجبور کرتا ہے۔ قریش کی لیڈر شپ کو یہ معلوم تھا کہ اگر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی مان لیا تو پھر انہیں قیادت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس کے بعد یہ لیڈر شپ خود بخود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منتقل ہو گی اور ان کے ہاتھ کچھ نہ رہے گا۔ اس وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے کٹر مخالفین وہی تھے جو قریش کے لیڈر تھے۔ ان میں خاص کر ابو جہل، ابو لہب، عتبہ بن ربیعہ، عاص بن وائل، ابی بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط نمایاں تھے۔ مدینہ ہجرت کے بعد عبد اللہ بن ابی اسلام کے لیے بڑا خطرہ بنا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اسے امید تھی کہ اہل مدینہ اسے اپنا بادشاہ مان لیں گے لیکن جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کیا تو اس کی بادشاہت خطرے میں پڑ گئی اور یہ منافق بن کر اسلام کی جڑیں کاٹنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

اس مفاد پرستانہ مخالفت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ عرب کے قبائلی نظام میں قریش کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ خانہ کعبہ سے تعلق کی بنیاد پر عرب قبائل قریش کا احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے تجارتی قافلوں کو لوٹتے نہیں تھے۔ قریش کے سفر جب محفوظ ہونے لگے تو پورے عرب کے لوگ ان کے قافلوں میں انویسٹمنٹ کرنے لگے۔ قریش نے دیگر قبائل کے ساتھ یکجہتی کے طور پر ان کے دیوتاؤں کے بتوں کو خانہ کعبہ میں نصب کر رکھا تھا۔ بہت سے قریشیوں کو یہ خدشہ تھا کہ اگر بت پرستی کے خلاف یہ دعوت پھیل گئی تو کہیں دیگر عرب قبائل ان کے دشمن نہ ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں وہ عرب میں جس قیادت و سیادت کے مزے لوٹ رہے تھے، وہ سلسلہ ختم نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قبائل کے بتوں کو چھوڑ دینے کے سبب وہ ان کے قافلوں پر حملے شروع کر دیں اور ان کی معیشت کا بیڑا غرق ہو جائے۔

دعوت اسلام کی مخالفت اور اس پر مسلمانوں کا ردعمل

اسلام کی دعوت کے مخالفین نے اسے ناکام بنانے کے لیے متعدد طریقے اختیار کیے اور ان کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جو حکمت عملی اختیار کرنے کا حکم دیا، اس کی تفصیل یہ ہے:

1۔ مخالفین نے پراپیگنڈا اور اعتراضات کا طوفان برپا کر دیا تاکہ اس کی مدد سے ان لوگوں کو بہکا سکیں جن کے اسلام سے متاثر ہونے کا خدشہ ہو۔ اس محاذ پر اللہ تعالی نے براہ راست مداخلت کرتے ہوئے ان کے اعتراضات کے مسکت جواب قرآن مجید میں نازل کر دیے۔ اس کی مزید تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

2۔ مخالفین نے جب یہ دیکھا کہ قرآن کی دعوت دلوں پر اثر کر رہی ہے تو وہ لوگوں کی توجہ اس سے ہٹانے لگے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم قرآن کی تلاوت فرماتے تو یہ بیچ میں شور مچانے لگتے۔ ولید بن مغیرہ حیرہ سے قصے کہانیوں کی کتابیں لے آیا اور وہ لوگوں کو سنانے لگا۔ نضر بن حارث نے اپنی خوبصورت لونڈیوں کی محفل موسیقی سجانی شروع کر دی۔ وہ جس شخص کو دیکھتا کہ وہ اسلام کی جانب مائل ہو رہا ہے تو ان لونڈیوں کے ذریعے ان پر ڈورے ڈلوانا شروع کر دیتا۔ لیکن قرآن کی دعوت میں اتنی کشش تھی کہ یہ سب ہتھکنڈے ناکام ہو گئے۔

3۔ کفار نے کمزور مسلمانوں پر ظلم و تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا نشانہ سب سے زیادہ وہ لوگ بنے جو یا تو غلام تھے یا پھر کسی بااثر قریشی خاندان کے حلیف تھے۔ ان میں بالخصوص حضرت بلال، یاسر، سمیہ، عمار، خباب، لبینہ اور زنیرہ رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ حضرت بلال اور خباب رضی اللہ عنہما کو تپتی ریت اور انگاروں پر گھسیٹا گیا۔ حضرت یاسر اور سمیہ رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا گیا۔ لبینہ اور زنیرہ رضی اللہ عنہما لونڈیاں تھیں جنہیں ان کے مالک تشدد کا نشانہ بناتے۔ بااثر گھرانوں کے بعض نوجوانوں جیسے حضرت عثمان، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم پر ان کے بزرگوں نے تشدد شروع کر دیا۔

اس ٹارچر سے نجات کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ ان مظلوم غلاموں کی آزادی کی تحریک شروع کی۔ اس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے۔ آپ نے تجارت کے ذریعے جو سرمایہ اکٹھا کر رکھا تھا، اس سے آپ غلام خرید خرید کر آزاد کرنے لگے۔ دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مسلمانوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کی اجازت دے دی گئی۔ بااثر گھرانوں کے نوجوانوں کے علاوہ وہ لوگ، جو قریشی خاندانوں کے حلیف تھے، مکہ چھوڑ چھوڑ کر حبشہ کی جانب ہجرت کرنے لگے جس سے انہیں ظلم و تشدد سے نجات مل گئی۔

4۔ جسمانی تشدد کے ساتھ نفسیاتی ٹارچر کا سلسلہ جاری رہا اور اس سے کوئی بھی مسلمان بشمول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ نہ تھا۔ باوجود اس کے کہ رسول اللہ کا تعلق قریش کے نہایت ہی بااثر خاندان بنو ہاشم سے تھا، پھر بھی آپ کو نفسیاتی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ کبھی آپ کی راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے، کبھی آپ کے گھر میں غلاظت پھینکی جاتی، کبھی آپ پر آوازے کسے جاتے تو کبھی دشنام طرازی کی جاتی۔ ایک بار حالت نماز میں آپ کے اوپر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی گئی۔ متعدد مرتبہ آپ پر جسمانی حملے بھی کیے گئے اور آپ کو زخمی کیا گیا۔ اس میں خاص کر ابو لہب پیش پیش تھا کیونکہ وہ خود بنو ہاشم کا حصہ تھا جبکہ دیگر خاندانوں کے لوگ پھر بھی لحاظ کر لیتے تھے۔ اس سب تشدد کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے یک طرفہ صبر کیا اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض ظلم کرنے والوں کے دل بھی موم ہوئے اور وہ لوگ جو غیر جانبدار تھے، بھی متاثر ہوئے۔

5۔ جب کفار نے یہ دیکھا کہ ظلم و تشدد کامیاب نہیں رہا تو انہوں نے مذاکرات کے ذریعے بھی کئی مرتبہ کوشش کی۔ کبھی قومی مفاد کی دہائی دی اور کبھی اتحاد کرنے کی پیشکش کی۔ یہ آفر بھی کی کہ آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں تو ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط پر اپنا بادشاہ ماننے کی آفر بھی دی کہ آپ اسلام کی دعوت کو ترک

کر دیں۔ جناب ابو طالب پر بھی انہوں نے دباؤ ڈالے رکھا کہ وہ رسول اللہ کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ اس اسٹریٹیجی کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور بادشاہت کی آفر پر فرمایا: ''اگر آپ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں پر چاند بھی لا کر دیں تو میں اس دعوت کو نہیں چھوڑوں گا۔''

6۔ قریش نے جب یہ دیکھا کہ اسلام کی دعوت سے دیگر قبائل کے لوگ بھی متاثر ہو رہے ہیں تو انہوں نے باہر والوں میں اسلام کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ جب بھی کوئی شخص مکہ آتا تو سب اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خبردار کرتے کہ یہ شخص جادوگر ہے اور اس کے قریب نہ جانا۔ اس پراپیگنڈا میں بھی ابو لہب پیش پیش تھا اور باقاعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کر کے ہر اس شخص کو آپ سے بدظن کرنے کی کوشش کرتا تھا جس سے آپ نے ملاقات کی ہو۔ بعض اوقات اس پراپیگنڈے کا نتیجہ الٹ بھی نکل آتا تھا۔ جیسے قبیلہ دوس کے سردار حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کو جب کفار نے نبی کریم کے خلاف بھڑکایا تو وہ خود آپ سے آکر ملے اور آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان لائے۔

7۔ عرب میں چونکہ یہود و نصاری کو ایک خاص مقام حاصل تھا اور یہ عربوں میں تعلیم یافتہ قومیں سمجھی جاتی تھیں، اس لیے نضر بن حارث نے ان کی مدد چاہی اور ان کی مدد سے خاص قسم کے سوالات تیار کیے۔

دعوتی میدان میں صحابہ کرام کا کردار

ویسے تو سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم دین کی تبلیغ کیا کرتے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داعیوں اور مبلغین کی ایک خاص جماعت تیار کر رکھی تھی۔ یہ لوگ قرآن مجید کا مطالعہ کرتے اور پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ عربوں میں چونکہ پڑھنے لکھنے کا زیادہ رواج نہیں تھا، اس وجہ سے ان کا نام ہی ''قاری (جمع قُرّا)'' مشہور ہو گیا۔ یہ لوگ ہمارے قاری صاحبان کی طرح قرآن مجید کو صرف پڑھنا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ اسے اچھی طرح سمجھتے تھے اور سمجھا سکتے تھے۔ جب ضرورت پیش آتی تو اسی جماعت کے لوگوں کو دعوتی وفد بنا کر مختلف قبائل کی طرف بھیجا جاتا۔ ان قاری حضرات کے نام تو تاریخ میں زیادہ محفوظ نہیں رہ سکے ہیں تاہم ان کے متعدد کارنامے ضرور موجود ہیں۔ بعض مواقع پر ان قاری حضرات نے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کیا۔ ان میں خاص طور پر دو واقعات مشہور ہیں: ایک سانحہ رجیع اور دوسرا سانحہ بئر معونہ۔

سانحہ رجیع اس طرح پیش آیا کہ قبیلہ بنو قارہ کے بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ کے ساتھ کچھ مبلغین کو بھیجیں۔ آپ نے حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں 10 مبلغین کو ان کے ساتھ بھیجا۔ کفار نے ان میں سے آٹھ مبلغین کو شہید کر دیا اور بقیہ تین کو اہل مکہ کے پاس فروخت کر دیا جنہوں نے جنگ بدر کا انتقام لینے کے لیے انہیں تکالیف دے کر شہید کیا۔[13] دوسرا سانحہ زیادہ بڑا تھا۔ اس میں انصار کے 70 مبلغین کی جماعت کو نجد بھیجا گیا جنہیں اسی طرح دھوکہ دہی سے

شہید کیا گیا۔[14] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سانحات کا اتنا دکھ ہوا کہ آپ مسلسل ایک ماہ تک نماز میں ان لوگوں کی ہلاکت کی دعا فرماتے رہے۔

ان داعی شہدا کے علاوہ سبھی صحابہ کرام نے دین کی دعوت و تبلیغ کی کوشش کی۔ بعض نے ان ڈائرکٹ طریقے سے اس دعوت میں حصہ لیا مگر چند ایسے صحابہ ہیں جنہوں نے براہ راست دعوت دین کے میدان میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ ان کے نام یہ ہیں:

1۔ داعی صحابہ میں سب سے نمایاں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ کا تعلق قریش کے اگرچہ ایک کمزور گھرانے بنو تیم سے تھا مگر آپ کو پورے قبیلہ قریش میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ سب لوگوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آتے تھے اور کمزوروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ مصیبت زدوں کا بوجھ اٹھاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے تھے۔ آپ علم الانساب کے ماہر تھے جس کی وجہ سے آپ کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تبلیغ ہی سے وہ صحابہ ایمان لائے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمایاں ترین صحابہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں حضرت عثمان، طلحہ، زبیر، سعد اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔[15] حضرت ابو بکر کی عادت یہ تھی کہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ قریش کی خواتین اور بچے اکٹھے ہو کر آپ کی تلاوت سنتے اور ان کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا ہوتی۔[16]

2۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صلاحیتوں کا اصل میدان پہلوانی، ایڈمنسٹریشن، پلاننگ اور اس نوعیت کے امور تھے مگر آپ کے قبول اسلام سے مسلمانوں کو اتنی تقویت ملی کہ وہ کھل کر اپنی دعوت پھیلا سکیں۔[17]

3۔ قریشی صحابہ میں دعوتی میدان میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو غیر معمولی مقام حاصل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے انہی کو مدینہ بھیجا تھا اور ان کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں اوس اور خزرج کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔[18]

4-15۔ انصار کے بارہ صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقیب یعنی سردار (Chief) مقرر فرمایا۔ ان لوگوں نے دعوت و تبلیغ کے میدان میں نمایاں کام کیا اور ان کی کاوشوں سے ان کے قبائل نے اسلام قبول کیا۔ ان کے نام یہ ہیں: حضرت اسعد بن زرارہ، سعد بن ربیع، عبد اللہ بن رواحہ، رافع بن مالک، براء بن معرور، عبد اللہ بن عمرو بن حرام، عبادہ بن صامت، سعد بن عبادہ، منذر بن عمرو، اسید بن حضیر، سعد بن خثیمہ اور رفاعہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہم۔[19] ان میں بالخصوص حضرت اسعد بن زرارہ خزرجی نے بہت دعوتی کام کیا اور انہی کی دعوت کے نتیجے میں قبیلہ اوس کے ایک اہم سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اسلام لائے اور ان کی دعوت سے ایک دن کے اندر اندر اوس کا ایک ذیلی قبیلہ بنو عبد الاشہل مسلمان ہوا۔[20]

16۔ دعوتی جدوجہد میں نمایاں مقام رکھنے والوں میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ انہوں نے نجاشی کے دربار میں وہ تقریر کی جو آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ حبشہ ہجرت کرنے والے لوگوں کے سربراہ آپ ہی تھے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کے

ساتھ حبشہ میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کی کاوشوں کے نتیجے میں یہاں اسلام پھیلا۔

17۔ اہل مکہ اور اہل مدینہ سے ہٹ کر اہم دعوتی شخصیات میں حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ نمایاں ہیں۔ یہ قبیلہ دوس کے سربراہ تھے اور ان کا قبیلہ طائف اور الباحہ کے درمیان آج تک آباد ہے۔ یہ مکہ حج کے لیے آئے تو کفار نے ان کے سامنے بہت پراپیگنڈا کیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ سنیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ پھر انہیں خیال آیا کہ میں تو سوچنے سمجھنے والا شاعر آدمی ہوں، کوئی مجھے کیسے گمراہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نبی کریم سے ملاقات کر کے آپ سے قرآن سنا اور ایمان لائے۔ پھر انہوں نے مسلسل کئی سال اپنے قبیلے میں دعوتی جدوجہد کی اور سات آٹھ سال بعد اپنے قبیلے کے 70-80 خاندانوں کو لے کر مدینہ حاضر ہوئے۔[21]

18۔ داعی صحابہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا بھی نمایاں مقام ہے۔ انہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کی خبر ملی تو یہ بھی مکہ حاضر ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے اپنے ایمان کا خانہ کعبہ میں اعلان کر دیا جس پر لوگوں نے انہیں بہت مارا۔ آخر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں بچایا اور کہا: "یہ شخص قبیلہ بنو غفار کا ہے، اگر یہ مر گیا تو تمہارا تجارتی راستہ بند ہو جائے گا۔" اگلے دن پھر ایسا ہی ہوا۔[22] اس کے بعد حضرت ابوذر اپنے قبیلے میں چلے گئے اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں ان کے پورے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔

دعوت دین میں خواتین نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا جو کتب سیرت و تاریخ میں بہت زیادہ نمایاں نہیں ہو سکا۔ صحابیات نے خاص کر یہ اہم کردار ادا کیا کہ اپنے شوہروں اور دیگر رشتے دار صحابہ کی دعوتی کام میں بھرپور حمایت اور مدد کی۔ انہوں نے گھر کی ذمہ داری سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ان صحابہ کو جوش اور جذبہ دلایا کہ وہ دین حق کے لیے ہر قسم کی قربانی دیں۔ ان میں سب سے نمایاں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں جنہوں نے اپنی پوری دولت کو اسلام کی دعوت کے لیے وقف کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر مشکل مرحلے پر ساتھ دیا۔ یہ اتنی بڑی کاوش تھی جس کی اہمیت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جو انسانی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت ایسی کی کہ وہ اسلام کے مبلغ بن سکیں۔

دیگر امہات المومنین اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں نے بھی اسلام کی راہ میں بہت قربانیاں دیں اور تکالیف سہیں۔ جن صحابیات نے اسلام کی راہ میں بہت زیادہ تکالیف سہیں، ان میں بالخصوص سیدہ ام سلمہ، ام حبیبہ، زینب و رقیہ بنت رسول اللہ، سمیہ، اور اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہم نمایاں تھیں۔

---

[1] صفی الرحمن مبارک پوری۔ الرحیق المختوم۔ 135-136

[2] بخاری۔ کتاب فضائل القرآن۔ حدیث 4707

[3] مبارک پوری۔163

[4] خالد مسعود۔ حیات رسول امی۔124

[5] Robert J. Barro, Jason Hwang, and Rachel M. McCleary. ***Religious Conversion in 40 Countries.*** Harvard University: Cornerstone Research Center. http://www.economics.harvard.edu/faculty/barro/files/Conversion%2Bpaper%2B072209%2B_2_.pdf (30 Jan 2013)

[6] بخاری۔ کتاب الکفالۃ۔ حدیث2175

[7] حاکم۔ المستدرک علی الصحیحین۔ کتاب التفسیر۔ حدیث3929۔ قاہرہ: دار الحرمین۔

[8] ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ۔ بحوالہ محمد کرم شاہ الازہری۔ ضیاء النبی۔294

[9] ابن ہشام بحوالہ ازہری۔ ایضا۔294

[10] بخاری۔ کتاب الکفالۃ۔ حدیث2175

[11] مبارک پوری۔140

[12] ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ۔ بحوالہ محمد کرم شاہ الازہری۔ ضیاء النبی۔2/300

[13] بخاری۔ کتاب المغازی۔ حدیث3858

[14] ایضا۔ حدیث3859, 3850

[15] مبارک پوری۔109

[16] بخاری۔ کتاب الکفالہ۔ حدیث1975

[17] مبارک پوری۔145

[18] ایضا۔206

[19] ایضا۔215

[20] ایضا۔207

[21] ایضا۔193

[22] بخاری۔ کتاب المناقب۔ حدیث3648

باب 6: دعوتی اسٹریٹیجی

مختلف گروہوں کے معاملے میں دعوتی اسٹریٹیجی

دعوت کا اصول یہ ہے کہ مخاطب کی نفسیات کے مطابق معاملہ کیا جائے۔ بات کو وہاں سے شروع کیا جائے جس پر مخاطب متفق ہے اور پھر استدلال کرتے ہوئے اس سے وہ بات منوائی جائے جہاں وہ مختلف رائے رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلوب دعوت میں گہری حکمت پائی جاتی تھی اور آپ ہر گروہ بلکہ ہر شخص کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی بجائے اس کی نفسیات کے مطابق اس سے معاملہ کیا کرتے تھے۔ اہل عرب میں مختلف مذہبی گروہ آباد تھے، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مختلف انداز میں معاملہ کیا گیا۔ اس کی کچھ تفصیل ہم یہاں بیان کر رہے ہیں:

مشرکین بنی اسماعیل کو دعوت

عربوں میں سب سے نمایاں گروہ مشرکین بنی اسماعیل کا تھا۔ یہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام کی اولاد تھے اور تقریباً 2000 برس تک توحید پر قائم رہے تھے۔ عہد نبوی سے تین چار سو سال پہلے عمرو بن لحی (c. 350-450) کے زمانے سے ان کے ہاں بت پرستی کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے باوجود ان میں ایک خدا کا تصور موجود تھا جس کے لیے اپنی زبان میں وہ "اللہ" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ کائنات کا خالق و مالک ایک اللہ ہی ہے اور وہی رزق دیتا ہے۔ بقیہ دیوتا اس کے مقرب بندے ہیں جنہیں اس نے کچھ خدائی طاقتیں عطا کی ہیں۔ اکثر مشرکین منات اور عزی کو وہ اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بادشاہ سے براہ راست کچھ عرض کرنے کی بجائے اس کے درباریوں سے سفارش کروائی جائے تو قبولیت کا امکان بڑھ جاتا ہے، اسی طرح ان دیوتاؤں سے سفارش کروائی جائے تو اللہ تعالی دعا قبول کر لیتا ہے۔

چونکہ توحید کا کچھ نہ کچھ تصور مشرکین عرب کے ہاں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ان کے اسی نظریے پر ضرب لگائی گئی اور اسی کی اپیل کی گئی۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ. فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۖ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ. كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ. قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ قُلِ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ. قُلْ هَلْ مِنْ

شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ ۗ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ ۖ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ.
وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ.

(اے نبی!) ان سے پوچھیے: ”آپ لوگوں کو کون آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون تمام معاملات کی تدبیر کرتا ہے؟“ وہ ضرور کہیں گے: ”اللہ۔“ پھر آپ کہیے: ”پھر آپ لوگ (شرک سے) پرہیز کیوں نہیں کرتے؟ یہی ہے اللہ، آپ لوگوں کا حقیقی رب، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہا گیا ہے؟ آخر یہ آپ لوگ کدھر پھرائے جا رہے ہیں؟“ اس طرح نافرمانی اختیار کرنے والوں پر آپ کے رب کی بات سچی ہو گئی کہ وہ کسی طرح مان کر نہ دیں گے۔

ان سے پوچھیے: ”کیا آپ لوگوں کے خیالی شریکوں میں سے کوئی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر دوبارہ کسی چیز کو تخلیق کرے؟“ کہیے: ”(یہ بات آپ لوگ بھی مانتے ہیں کہ) وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور دوبارہ بھی وہی تخلیق کرتا ہے۔ پھر آپ لوگ یہ کس الٹی راہ پر چلائے جا رہے ہیں؟“

ان سے پوچھیے: ”آپ لوگوں کے (خیالی) شریکوں میں سے کوئی ایسا بیچ ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو؟“ کہیے: ”وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتایئے، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جسے خود بغیر راہنمائی کے راہ نہیں ملتی؟ آخر آپ لوگوں کیسے فیصلے کرتے ہیں؟“ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض وہم و گمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں حالانکہ محض گمان حق کی ضرورت کو بالکل پورا نہیں کرتا۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اسے بخوبی جانتا ہے۔ (یونس 10:31-36)

مشرکین بنی اسماعیل، حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام کا بہت احترام کرتے تھے اور خود کو ان کے دین کا علم بردار بتاتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے بارے میں یہ بات معروف تھی کہ یہ توحید کے علم بردار تھے اور ان کی زندگی ہی شرک کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے گزری۔ دوسری طرف عربوں میں شرک کا رواج ہو گیا تھا۔ عقلی اعتبار سے یہ دو متضاد باتوں کو بیک وقت ماننے والی بات تھی کہ توحیدی دین کے ساتھ وابستگی کا اعلان کیا جائے اور ساتھ ہی شرک بھی کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کے عقل مند لوگ شرک سے دور رہتے اور خود کو دین حنیفی کا پیروکار کہتے۔ عام مشرکین کو اگرچہ یہ احساس ہوتا کہ وہ عقلی اعتبار سے غلط کام کر رہے ہیں لیکن وہ خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے کہ ان کے آباؤ اجداد ایسا کرتے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے دین کی پیروی کی اپیل ملتی ہے۔

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ.

آپ کہیے: ”یقیناً مجھے میرے رب نے مجھے سیدھے راستے کی جانب ہدایت عطا کی ہے جو کہ ایک قائم دین ہے، ابراہیم کا سیدھا اور یکسو راستہ۔ اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔ (الانعام 6:161)

عربوں کے ہاں چونکہ سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ چونکہ ان کے آباؤ اجداد ایسا کرتے آئے ہیں، اس لیے ان کے راستے سے ہٹنا، ان کی شان میں گستاخی ہو گی۔ یہ بہت عقل مند لوگ تھے اور انہوں نے سوچ سمجھ کر شرک کی راہ اختیار کی ہو گی۔ یہ وجہ ہے کہ ان مشرکین کو دعوت دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا کہ وہ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کی بجائے اپنی عقل کو استعمال کریں۔ ضروری نہیں کہ ان کے آباؤ اجداد بہت ہی عقل مند قسم کے لوگ ہوں بلکہ وہ بھی کسی گمراہی اور بے وقوفی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اس طرح سے قرآن مجید نے آباپرستی اور اندھی تقلید کو خاص کر نشانہ بنایا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ.

جب ان سے کہا گیا کہ اللہ نے جو کچھ نازل کیا ہے، اس کی پیروی کیجیے تو وہ کہنے لگے: ”نہیں، بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔“ اگرچہ ان کے آباؤ اجداد کسی چیز کی عقل نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی ہدایت یافتہ ہوں۔ (البقرۃ 2:170)

مشرکین عرب کو دعوت دیتے ہوئے اس بات کو بھی موضوع بنایا گیا کہ دین ابراہیمی میں جو اضافے انہوں نے اپنی جانب سے کر لیے ہیں، ان کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ ہمیں قرآن مجید میں نماز، حج اور قربانی سے متعلق مشرکین کی بدعات پر تنقید ملتی ہے۔

مشرکین عرب کو دی گئی اس دعوت کے نتائج خاطر خواہ نکلے۔ قرآن کے پے در پے سوالات کے نتیجے میں ان کے عام لوگوں کے ذہنوں میں برف پگھلنے کا عمل شروع ہوا اور انہیں غور و فکر کی عادت پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ یکے بعد دیگرے وہ اپنی سابقہ رسوم کو چھوڑنے لگے اور آہستہ آہستہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

یہود کو دعوت

مکہ مکرمہ میں یہودی نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس وجہ سے مکی سورتوں میں ہمیں یہود کو دی گئی دعوت کے آثار بہت کم ملتے ہیں۔ مدنی سورتوں میں البتہ بہت تفصیل سے یہودیوں کو اسلام کی دعوت ملتی ہے، ان کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب ملتے ہیں اور بالآخر قرآن مجید کا لہجہ ان سے متعلق بہت سخت ہو جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کے حکم سے اپنی نمازوں کا قبلہ بھی بیت المقدس کو بنالیا تھا۔ یہ ایک نوعیت کا دعوتی اقدام تھا تاکہ یہود اسلام سے اجنبیت محسوس نہ کریں۔ یہودیوں کو ڈیڑھ سال تک بھرپور دعوت دی گئی اور ان کے بعض لوگ ایمان بھی لائے لیکن جب انہوں نے مخالفت کا رویہ اختیار کیا تو پھر اللہ تعالی نے قبلے کی تبدیلی کا حکم دے دیا۔

یہودیوں کو دعوت دیتے ہوئے قرآن مجید میں ان نکات پر خاص زور دیا گیا:

- دین ابراہیم کی پیروی کی دعوت
- یہود کی مذہبی کتب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بشارتوں کو ماننے کی دعوت

- اخلاقی بگاڑ کی اصلاح کی دعوت
- یہود کا خود کو سب سے افضل قوم قرار دینے کے دعوی کی تردید

یہودی حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا بہت احترام کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ آپ بھی یہودی تھے۔ اس کی سخت تردید کرتے ہوئے اللہ تعالی نے یہ بیان فرمایا کہ یہ دعوی کیسے درست ہو سکتا ہے جبکہ یہودیت، حضرت ابراہیم کے سینکڑوں سال بعد وجود میں آئی ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ. هَا أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ. مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ.

اے اہل کتاب! آپ لوگ ابراہیم کے بارے میں کیوں بحث کرتے ہیں جبکہ تورات اور انجیل تو ان کے کہیں بعد نازل ہوئی؟ کیا آپ لوگ عقل نہیں رکھتے؟ جن چیزوں کے بارے میں آپ کے پاس علم تھا، ان کے متعلق تو آپ بڑی بحثیں کر چکے ہیں لیکن آپ ایسے معاملے میں بحث کیوں کر رہے ہیں جس کے بارے میں آپ کے پاس علم نہیں ہے؟ حالانکہ جاننے والا تو اللہ ہے، آپ لوگ نہیں۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی تھے بلکہ آپ ایک یکسو مسلم تھے اور مشرکین میں سے بھی نہیں تھے۔ لوگوں میں ابراہیم کے قریب ترین وہی ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی یعنی یہ نبی اور اہل ایمان۔ اللہ مومنین کا مددگار ہے۔ (آل عمران 3:65-68)

یہودیوں کی مذہبی کتب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو پیش گوئیاں موجود تھیں، وہ اس درجے کی تھیں کہ انہیں اس بات میں کوئی شبہ نہ تھا کہ نبی اکرم اللہ کے سچے رسول ہیں یا نہیں۔ یہ محض ان کا حسد تھا جس نے انہیں ایمان لانے سے روکا۔ انہیں غصہ اس بات کا تھا کہ آخری پیغمبر بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں کیسے آ گیا جب کہ وہ انہیں حقیر سمجھتے تھے۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ.

جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی، وہ ان (نبی) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو۔ یقیناً ان میں سے ایک فریق حق کو جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔ (البقرۃ 2:146)

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا.

کیا یہ لوگ اس بات پر حسد کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے ان (مومنین) کو نوازا۔ ہم (اس سے پہلے) ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم سلطنت عطا کر چکے ہیں۔ (النسا 4:54)

یہودیوں کے اندر بہت بڑا اخلاقی بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ حق کو چھپانا، رشوت لے کر دینی احکام میں تبدیلی کر دینا، لوگوں کا مال مختلف ہتھکنڈوں سے ہتھیانا، سود کھانا اور اس نوعیت کے بہت سے اخلاقی امراض میں وہ مبتلا تھے۔ ان کے مذہبی علما انہیں اپنا نفسیاتی غلام بنا کر

رکھتے اور اس طرح سے ان کا جانی، مالی اور نفسیاتی استحصال کرتے۔ قرآن مجید نے اپنی دعوت میں اس کو خاص موضوع بنایا اور جہاں یہود کے برے لوگوں کی روش پر تنقید کی، وہاں ان کے نیک لوگوں کی تعریف بھی کی:

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ. بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ. إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ. مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ. وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ.

اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر آپ اس پر اعتماد کرتے ہوئے مال و دولت کا ڈھیر بھی اسے دے دیں تو وہ آپ کا مال واپس کر دے گا۔ اور کسی کی حالت یہ ہے کہ آپ اس پر ایک دینار کے معاملے میں بھی بھروسہ کریں تو وہ اس وقت تک ادا نہیں کرے گا جب تک آپ اس کے سر پر سوار نہ ہو جائیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''امیوں (یعنی غیر اسرائیلیوں) کے معاملے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔'' یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ (آخر ان پر ذمہ داری کیوں نہیں ہے؟) جو شخص بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا، وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیونکہ متقی لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ، جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں (گناہوں سے) پاک کرے گا، بلکہ ان کے لیے تو دردناک عذاب ہے۔

ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو (اللہ کی) کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ آپ سمجھیں کہ وہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں، وہ کتاب ہی کا حصہ ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ پڑھ رہے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا اور وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب، حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو۔ وہ آپ سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی آپ کو مسلم ہوتے ہوئے کفر کا حکم دے؟ (آل عمران 3:75-80)

یہودیوں کے ہاں یہ تصور موجود تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی قوم (Chosen People) ہیں۔ اس وجہ سے وہ جو کچھ بھی کر لیں، اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دیں گے اور اگر سزا کی نوبت بھی آئی تو یہ چند دن کی ہو گی۔ سورۃ البقرۃ میں اس بات کو موضوع بنا کر ان کی تردید کی گئی اور دلیل کے طور پر یہود کو ان کی تاریخ کے ایسے واقعات، جو آج بھی بائبل میں موجود ہیں، سنائے گئے جب اللہ نے انہیں سزا دی

تھی۔ اس کا مقصد انہیں یہ بتانا تھا کہ اگر وہ واقعی چہیتی قوم ہوتے تو پھر ان کے آباؤ اجداد کو سزا کیوں ملتی؟ اللہ تعالی نے انہیں اس دنیا میں سرفرازی دینے کا جو وعدہ کیا تھا، وہ اس بات سے مشروط تھا کہ وہ اللہ تعالی کے احکام کی پیروی کریں گے۔ اس وعدے میں ساتھ یہ بات بھی تھی کہ اگر انہوں نے نافرمانی کی تو انہیں سزا بھی ملے گی۔ اب ان کا کام یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں۔ اگر انہوں نے یہ پیروی نہیں کی تو پھر وہ سزا کے مستحق ہوں گے۔

یہود کے بعض نیک دل لوگوں پر قرآن مجید کی اس دعوت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور یہ لوگ ایمان لے آئے۔ ان میں سب سے نمایاں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تھے جو تورات کے بہت بڑے عالم تھے اور یہود ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور یہودی بھی ایمان لائے۔ اوس اور خزرج کے بہت سے لوگوں نے بھی یہودی مذہب اختیار کر رکھا تھا، یہ سب کے سب ایمان لے آئے۔ قرآن مجید میں ان کی بہت تعریف کی گئی ہے:

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ.

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے اور وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں، جیسا پڑھنے کا حق ہے تو یہی لوگ اس پر ایمان لانے والے ہیں۔ جنہوں نے اس سے کفر کیا، تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (البقرۃ 2:121)

ان چند حق پرستوں کو چھوڑ کر یہود کی اکثریت نے قرآن کی اس دعوت کو سوچ سمجھ کر اپنے تعصبات کی وجہ سے نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ اس دعوت کی مخالفت پر اتر آئے۔ اگرچہ ان کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدے تھے، لیکن انہوں نے خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں پر حملے کیے اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے خلاف فوجی کاروائی کرنا پڑی۔

عیسائیوں کو دعوت

قرآن مجید میں عیسائیوں کو بھی اسلام کی دعوت کا خاص موضوع بنایا گیا۔ عرب میں عیسائی کم تھے۔ مکہ اور اس کے گرد و نواح میں بعض عیسائی آباد تھے جو یا تو غلام تھے یا پھر چھوٹے موٹے کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے سورۃ مریم نازل ہوئی جس میں نہایت ہی دلنشیں پیرائے میں عیسائیت کی تاریخ اور دعوت کا بڑے مثبت انداز میں ذکر ہے۔ ساتھ ہی عیسائیوں کے اس نظریے کی تردید بھی ہے کہ حضرت عیسی علیہ الصلوۃ والسلام خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔ مکہ کے قرب و جوار کے عیسائیوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا اور ایمان لے آئے۔ ہجرت حبشہ کے بعد حبشہ میں صحابہ کرام نے دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ نجاشی رضی اللہ عنہ کا تعلق عیسائیوں کے توحیدی فرقے سے تھا۔ اسی فرقے کے بعض لوگ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سن کر بہت روئے اور ایمان لائے۔[1] ان کے بارے میں ارشاد باری تعالی ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ. وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ

يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ. وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ. فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ.

آپ لوگ اہل ایمان کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پائیں گے اور اہل ایمان کے لیے دوستی میں قریب ترین ان لوگوں کو پائیں گے جنہوں نے کہا کہ ہم عیسائی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا درویش پائے جاتے ہیں اور ان میں تکبر نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں: ''ہمارے رب! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لیجیے۔'' اور کہتے ہیں: ''آخر ہم کیوں اللہ پر ایمان نہ لائیں اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ہے، جبکہ ہماری خواہش ہے کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔'' ان کی اس بات کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے دریا جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ نیک رویہ اختیار کرنے والوں کی جزا ہے۔ (المائدہ 85-82:5)

عیسائیوں کے ساتھ دوسرا معاملہ اس وقت ہوا جب یمن میں بہت بڑی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ یہاں نجران کے علاقے میں عیسائیوں کی اکثریت تھی، چنانچہ ان کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور ان کے ساتھ گفت وشنید ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوالات کے جواب دیے اور انہیں توحید کے مشترک عقیدے کو ماننے کی دعوت دی۔ اللہ تعالی کے حکم سے آپ نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی جس کے مطابق دونوں فریقوں کو مل کر اللہ سے دعا کرنا تھی کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو، اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ عیسائیوں نے اس مباہلہ کو قبول نہیں کیا اور مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح سے نجران کا علاقہ اسلامی حکومت میں شامل ہو گیا اور یہاں دعوت پھیلتی رہی۔ یہی معاملہ شمال کے عیسائی قبائل جیسے بنو طے اور بنو کلب کے ساتھ ہوا۔ یہ لوگ اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے اور آہستہ آہستہ ان کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

انٹرنیشنل سطح پر حبشہ کے عیسائیوں میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا جس کے نتیجے میں یہاں کی بڑی آبادی نے اسلام قبول کیا۔ پھر شام، مصر اور عراق فتح ہونے کے بعد یہاں کے عیسائیوں میں بھی دعوت و تبلیغ کا کام ہوا، جس کی تفصیل ہم عہد صحابہ میں بیان کریں گے۔

حنفا کو دعوت

آپ پڑھ چکے ہیں کہ عربوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو خود کو دین ابراہیمی کا پیروکار کہتا تھا۔ یہ لوگ حنیف (جمع حنفا) کہلاتے تھے جس کا مطلب ہے ایسا شخص جو یکسو ہو۔ یہ توحید کے ماننے والے اور بہت عبادت گزار لوگ تھے اور عرب شاعری میں ان کا ذکر اسی حیثیت سے ملتا ہے۔ سبھی قبائل میں اکا دکا حنفا موجود ہوا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں انہیں خاص طور پر ہدف بنا کر ان تک اپنی دعوت پہنچائی جس کے نتیجے میں حنفا میں سے اکثر لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ نبی اکرم کی دعوت دین ابراہیمی کو ماننے کی دعوت تھی۔

منافقین کو دعوت

مدنی زندگی میں اسلام کو منافقین سے واسطہ پیش آیا۔ یہ دو طرح کے تھے: ایک تو وہ منافق تھے جو دل میں اسلام کی دشمنی رکھتے تھے اور اس کی جڑیں کاٹنا چاہتے تھے۔ دوسری قسم کے منافقین وہ تھے جو اسلام کے دشمن نہیں تھے مگر دل ہی دل میں اس پر مطمئن بھی نہیں تھے۔ پہلی قسم کے منافقین کے ساتھ بہت سختی کی گئی اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا جبکہ دوسری قسم کے منافقین کے ساتھ نرمی برتی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا ذہن صاف ہوتا چلا گیا اور یہ اسلام پر جم گئے۔ قرآن مجید میں نفاق اور منافقین کا ذکر اس نفرت سے ملتا ہے کہ کوئی انسان خود پر یہ لیبل لگانا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ دوسری قسم کے منافقین نے اپنا احتساب کیا اور اسلام کے ساتھ مخلص ہوتے چلے گئے۔ پہلی قسم کے منافقین البتہ سختی سے اسلام دشمنی پر جمے رہے اور مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کرتے رہے جس میں اللہ تعالی نے انہیں ناکام کر دیا۔ سورۃ توبہ میں ان دونوں گروہوں کا ذکر اس طرح آیا ہے:

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ. وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ.

آپ کے ارد گرد جو دیہاتی ہیں، ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں سے بھی کچھ لوگ منافق ہیں جو اپنے نفاق میں منجھے ہوئے ہیں۔ آپ انہیں نہیں جانتے مگر ہم انہیں جانتے ہیں۔ ہم انہیں دوبار سزا دیں گے، پھر وہ ایک عذاب عظیم کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنی گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انہوں نے کچھ نیکیاں اور کچھ برائیاں ساتھ ہی کمائی ہیں۔ امید ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر فرمائے کہ اللہ غفور ورحیم ہے۔ (التوبہ 9:101-102)

مکہ میں دعوتی حکمت عملی (Strategy)

اس سیکشن میں ہم ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دین کے لیے کیا ذرائع اور وسائل اختیار فرمائے؟ اس دعوت میں معجزات کا کردار کیا تھا؟ کیا ایک ہی دعوتی حکمت عملی اختیار کی گئی یا پھر مختلف گروہوں کے ساتھ مختلف معاملہ کیا گیا؟ وقت کے ساتھ ساتھ دعوتی حکمت عملی میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں؟

ذرائع ووسائل کا استعمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے ہر طرح کے جائز ذرائع اور وسائل کو استعمال کیا۔ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ عربوں کے ہاں ادبیت اور فصاحت وبلاغت کو غیر معمولی حیثیت حاصل تھی اور اس کا ظہور زیادہ تر خطبات اور شاعری کی صورت میں ہوتا تھا۔ قرآن مجید نے خطیبانہ اور شاعرانہ اسلوب کو ملا کر ایک ایسا اسلوب پیش کیا جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زبان نہایت ہی فصیح وبلیغ تھی اور آپ کے اپنے ارشاد کے مطابق یہ قبیلہ قریش سے تعلق اور بنو سعد (سیدہ

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کا قبیلہ) کے ہاں پرورش کا نتیجہ تھی۔ اگرچہ اعلان نبوت سے پہلے آپ کی خطابت کا سراغ نہیں ملتا لیکن اعلان نبوت کے بعد آپ ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ خطیب کے طور پر سامنے آئے۔

مکی زندگی میں شاعری کو بطور ذریعہ تبلیغ استعمال نہیں کیا گیا کیونکہ قرآن مجید کے سامنے سبھی شاعروں کے چراغ گل ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذاتی طور پر شاعری کو پسند نہیں فرماتے تھے اور قرآن مجید میں بھی اس کی تردید کی گئی ہے۔ مکی زندگی میں کوئی بہت بڑا شاعر بھی اسلام نہیں لایا۔ صرف الاعشی متاثر ہوا مگر اسے اونٹوں کی رشوت دے کر اسلام لانے سے روک دیا گیا۔ مدنی زندگی میں البتہ بڑے بڑے شعرا جیسے حضرت عبد اللہ بن رواحہ، حسان بن ثابت، کعب بن زہیر اور خنسار ضی اللہ عنہم ایمان لائے اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے دعوت و تبلیغ کا مشن جاری رکھا۔

دعوت پھیلانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے یہ ذرائع استعمال کیے:

1۔ اجتماعات کا استعمال: عرب میں سب سے بڑا اجتماع حج کا ہوا کرتا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے باہر کے لوگوں تک اپنی دعوت پہنچائی۔ اسی طرح تجارتی میلوں کے اجتماعات میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جا کر وہاں اپنی دعوت پیش کیا کرتے تھے۔

2۔ تلاوت قرآن کے ذریعے دعوت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ قرآن مجید کی تلاوت نہایت ہی دلنشیں آواز میں کیا کرتے تھے۔ یہ سن کر لوگوں کے دل و دماغ کی دنیا زیر و زبر ہو جایا کرتی تھی۔

3۔ کوہ صفا کی اہمیت کا استعمال: مکہ میں صفا کی پہاڑی کو ایک خاص مقام حاصل تھا اور نذیر عریاں کے تصور سے آپ واقف ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس طریقے کو اختیار کیا البتہ اپنی پیغمبرانہ شان کے مطابق برہنگی جیسی بیہودگی سے پرہیز فرمایا۔

4۔ قبائلی تعلقات کا استعمال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل اور ان کے درمیان تعلق کو اپنی دعوت کے لیے کامیابی سے استعمال فرمایا۔ عرب میں چونکہ رواج تھا کہ قبیلہ ہر قیمت پر اپنے رکن کی حفاظت کرتا تھا چنانچہ اسی اصول کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہاشم کی حمایت کو قبول کیا۔ چونکہ ایک قبیلے اور خاندان کے لوگوں میں محبت اور انس ہوتا تھا، اس لیے اسلام قبول کرنے والے صحابہ نے اپنے اپنے خاندانوں اور قبائل میں دعوت پھیلائی۔

5۔ ذاتی تعلقات اور اثر و رسوخ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی تعلقات اور اثر و رسوخ کو بھی دعوت دین کے لیے استعمال فرمایا۔ جیسا کہ پچھلے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ آپ کے ذاتی تعلقات حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے تھے اور اس کی مدد سے آپ نے اہل ایمان کے لیے ایک باعزت جائے پناہ تلاش کی اور پھر یہی نجاشی ایمان بھی لائے۔ اسی طرح مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے ذاتی تعلقات کی مدد سے دعوت کو پھیلایا۔

6۔ رول ماڈلنگ کے ذریعے دعوت: دعوت دین میں الفاظ اتنے موثر نہیں ہوتے جتنا انسان کا کردار ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تربیت کے زیر اثر صحابہ کرام نے ایسے اعلی اخلاق اور کردار کا مظاہرہ کیا کہ لوگوں کے دل موم ہونے لگے اور وہ اس دین میں شامل ہونے لگے۔

معجزات نبوی کا دعوت کی مقبولیت میں کردار

معجزہ ایک ایسا کرشمہ ہوتا ہے جو انسان کی عقل سے پردے کو ہٹادے اور انسان یہ ماننے پر مجبور ہو جائے کہ معجزہ پیش کرنے والا واقعی اللہ تعالی کا بھیجا ہوا پیغمبر ہے۔ معجزہ حسی (Physical) بھی ہو سکتا ہے اور معنوی (Virtual) بھی۔ جیسے حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام کے عصا کا سانپ بننا ایک حسی معجزہ ہے جبکہ قرآن مجید کا بلیغ کلام ہونا ایک معنوی معجزہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دین کے لیے حسی معجزات کا زیادہ استعمال نہیں فرمایا۔ آپ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید تھا جس کے معجزہ ہونے کو خود اس کے منکرین بھی تسلیم کرتے تھے مگر اپنے تعصب کے سبب اسے مانتے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ جب کفار نے کسی معجزے کا مطالبہ کیا تو ان کے اس مطالبے کو خود قرآن نے مسترد کر دیا اور اس بات پر زور دیا کہ قرآن کا معجزہ ہونا کافی ہے۔ اس کی وجہ یہی بیان کی گئی کہ حسی معجزہ کے بعد اہل مکہ کو دی گئی مہلت ختم ہو جائے گی اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائے تو ان پر اللہ کا عذاب آجائے گا۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ. أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ.

کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ان چیزوں میں سے کسی چیز کو (بیان کرنے سے) چھوڑ دیں جو آپ کی جانب وحی کی جارہی ہیں اور اس بات پر تنگ دل ہوں کہ وہ کہیں گے: ”اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا؟“ یا یہ کہ ”اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا؟“ آپ تو محض خبر دار کرنے والے ہیں، ہر چیز کا ذمہ دار اللہ ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ ان صاحب (نبی) نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ آپ کہیے: ”اگر یہ بات ہے تو اس جیسی دس سورتیں ہی آپ لوگ بھی گھڑ لائیے اور اللہ کے سوا اور جن جن حمایتیوں کو مدد کے لیے آپ بلانے کی طاقت رکھتے ہیں، انہیں بلا لیجیے، اگر آپ لوگ سچے ہیں۔“ (ہود 11:12-13)

حسی معجزہ پیش نہ کرنے کی وجہ یہی بیان کی گئی کہ حسی معجزہ کے بعد اہل مکہ کو دی گئی مہلت ختم ہو جائے گی اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائے تو ان پر اللہ کا عذاب آجائے گا۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ.

وہ بولے: ”ان پر کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟“ اگر ہم ان پر کوئی فرشتہ نازل کرتے تو پھر معاملے کا فیصلہ کر دیا جاتا اور انہیں مہلت نہ دی جاتی۔ (الانعام 6:8)

مکی زندگی میں واقعہ ہونے والا اہم ترین حسی معجزہ شق القمر تھا جو کہ مکی زندگی کے آخری ایام میں پیش آیا۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اہل مکہ کے مطالبہ کے بعد چاند کے دو ٹکڑے کر کے انہیں دکھا دیا گیا۔ اس واقعہ میں یہ اعلان تھا کہ اب ان پر عذاب کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بھی جن لوگوں نے انکار اور دشمنی کی روش اختیار کی، ان پر پھر غزوہ بدر میں اللہ تعالی کے عذاب کا کوڑا برسا اور انہیں سزا دے دی گئی۔

اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ. وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ. وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۚ وَكُلُّ أَمْرٍ مُسْتَقِرٌّ

(عذاب کی) گھڑی اب قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔ یہ کوئی بھی نشانی دیکھیں گے تو منہ پھیر کر یہی کہیں گے کہ یہ پہلے سے چلا آنے والا جادو ہے۔ انہوں نے (آپ کو) جھٹلایا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ (القمر 54:1-3)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو معجزات کتب حدیث میں بیان ہوئے ہیں، ان کا بنیادی مقصد کفار پر اتمام حجت نہیں بلکہ نبی کریم اور اہل ایمان کے دلوں کو تسکین اور اطمینان دینا تھا۔ واقعہ معراج ایک معجزہ ہے اور اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زبردست نفسیاتی تسکین حاصل ہوئی۔ کم کھانے میں برکت بھی ایک معجزہ ہے جس سے صحابہ کرام کے ایمان کو تقویت حاصل ہوئی۔

مکی زندگی کے مختلف ادوار میں دعوتی اسٹریٹیجی

دعوتی حکمت عملی کے اعتبار سے مکی زندگی کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- پہلا دور 612-609 کے ابتدائی تین سالوں پر مشتمل تھا۔ اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کو خاص خاص لوگوں تک پہنچایا اور اس کے نتیجے میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد اسلام میں داخل ہوئی جو شرک اور اخلاقی بگاڑ سے بیزار تھے۔
- دوسرا دور 614-612 کے دو سالوں پر مشتمل ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے عام دعوت شروع کی اور مسلم کمیونٹی کو شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔
- تیسرا دور 619-614 کے پانچ سالوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک جانب مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے اور یہاں دعوت کا کام کرنے لگے۔ دوسری طرف مکہ اور اس کے باہر کے عرب قبائل میں اسلام کی دعوت پھیلنے لگی۔ حضرت حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما کے قبول اسلام کے بعد مسلمانوں کو زبردست تقویت حاصل ہوئی اور وہ کھلے عام نماز پڑھنے لگے۔ اسی دور میں بنو ہاشم کا بائیکاٹ کیا گیا اور انہیں شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔
- چوتھا دور 622-619 کے تین سالوں پر مشتمل ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ توجہ مکہ سے باہر کے قبائل پر دی۔ دورہ طائف بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ حج کے موقع پر مکہ آنے والے قبائل کو آپ خصوصی دعوت دیا کرتے تھے۔ اسی دعوت کے نتیجے میں یثرب کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب

بن عمیر رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیجا جن کی دعوت کے نتیجے میں یہاں کی آبادی کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔

مکی زندگی کے اختتام پر دعوت اسلام کے نتائج

مکی زندگی کے مختلف ادوار میں دعوت اسلام کے نتیجے میں جزیرہ نما عرب اور اس سے باہر کچھ مسلم کمیونیٹیز وجود میں آئیں۔ مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے لیکن ہم جو اندازے کر سکتے ہیں، ان کے مطابق پہلے تین سال کے دوران 40 افراد ایمان لائے، پھر ہجرت حبشہ کے وقت 83 افراد نے ہجرت کی۔ اگر اتنے ہی مسلمان مکہ میں رہ گئے ہوں تو ان کی کل تعداد ہجرت حبشہ کے وقت 150 کے قریب ہو گی۔ اگلے پانچ سال تک ان میں سست روی سے اضافہ ہوتا رہا اور اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ 619 تک تین چار سو کے قریب لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ اس کے بعد جب یثرب میں اسلام پھیلا تو اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور ہجرت کے وقت مسلمانوں کی کل تعداد 1000 کے قریب افراد پر مشتمل ہو گی۔ مسلم آبادی کی پاکٹس کو اس نقشے میں سبز رنگ میں دکھایا گیا ہے:



ہجرت نبوی کے موقع پر مسلم پاکٹس

(بشکریہ: سامی بن عبد اللہ الملعوث۔ الاطلس التاریخی لسیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ص 90۔ ریاض: مکتبہ العبیکان)

مدینہ میں دعوتی حکمت عملی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مکی زندگی میں مختلف قبائل عرب کو دعوت دیا کرتے تھے۔ اگرچہ یثرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ننھیال تھا اور آپ کی والدہ ماجدہ اور دادی محترمہ کا تعلق بھی یہیں سے تھا، تاہم بالکل ابتدا میں یہاں اسلام کی دعوت نہیں پھیل سکی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ دعوت یا تو اہل مدینہ کو پہنچی نہیں یا اگر پہنچی تو انہوں نے سنجیدگی سے اس پر غور نہیں کیا۔

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں کے دونوں بڑے قبائل اوس اور خزرج کے درمیان جنگوں کا ایک طویل سلسلہ رہا تھا اور یہ لوگ انہی میں مشغول تھے۔ 618 میں یہاں ایک بڑی جنگ ہوئی جو "بعاث" کہلاتی ہے۔

عام الحزن کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل میں دعوتی کام تیز کر دیا اور بالآخر یثرب کے چوٹی کے چھ افراد نے 620 میں اسلام قبول کر لیا۔ انہوں نے واپس جا کر اپنی قوم میں تبلیغ کی جس کے نتیجے میں یہاں اوس اور خزرج دونوں کے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اگلے سال 12 افراد حج کے لیے آئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ آپ نے ان کے ساتھ حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا جنہوں نے اپنی غیر معمولی تبلیغی اور تعلیمی صلاحیتوں سے اس پورے معاشرے کو اسلامی رنگ میں ڈھال لیا۔ 622 میں یہاں سے 73 افراد کا قافلہ مکہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر کے آپ کو یثرب آنے کی دعوت دی جسے آپ نے اللہ تعالی کے حکم سے قبول کر لیا۔ اس طرح سے یثرب میں پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی اور یہ مدینہ منورہ بن گیا۔

مدینہ منورہ میں دعوت کی قبولیت کے اسباب

دیگر قبائل کی نسبت اسلام کی دعوت کو مدینہ منورہ میں عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدینہ میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ اس شہر میں اسلام تیزی سے پھیلا جبکہ عرب کے بقیہ شہر اور قبائل اس سے محروم رہے۔ مدینہ منورہ کی تاریخ پر غور کیا جائے تو اس کی یہ وجوہات سامنے آتی ہیں:

1۔ مدینہ کے باشندے ایک پیغمبر کی آمد کے منتظر تھے۔ یہاں یہودی قبائل آباد تھے جن کی کتب میں ایک پیغمبر کی تشریف آوری کی خبر تھی۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ یہود، اس پیغمبر کے ذریعے اپنی فتح اور غلبے کے منتظر تھے۔ جب ان کی عربوں سے لڑائی ہوتی تو یہ انہیں کہتے: "ہمارے پیغمبر کو آ لینے دو، پھر ہم تمہیں بتائیں گے۔" جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت خزرج کے چھ افراد کے سامنے پیش کی تو قرآن کو سن کر انہیں یقین ہو گیا کہ یہ اللہ تعالی کا کلام ہے اور حضور سچے رسول ہیں۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو کہا: "یہ وہی نبی ہیں جن کا حوالہ دے کر یہودی ہمیں دھمکیاں دیتے تھے۔ کیوں نہ ہم ان یہود سے پہلے ان پر ایمان لے آئیں؟" چنانچہ یہ لوگ ایمان لے آئے اور اسی بنیاد پر اپنے قبیلوں کو اسلام کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔[3]

2۔ جنگ بعاث کی تباہ کاریوں سے سب سے زیادہ اوس اور خزرج متاثر ہوئے۔ ان کے بہترین لوگ اس جنگ میں مارے گئے، بہت سی خواتین بیوہ اور بچے یتیم ہوئے اور ان کی آبادی کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ دونوں قبائل کے معقول لوگوں میں یہ خواہش تھی کہ کوئی ایسا سیاسی نظام قائم ہو جس میں سب لوگ امن کے ساتھ رہ سکیں۔ خزرج کے بعض لوگوں نے اپنے ایک سردار عبد اللہ بن ابی کو مدینہ کے سبھی قبائل کا سربراہ بنانے کی تجویز دی، جسے اگرچہ سب نے قبول نہیں کیا لیکن ایک تحریک پیدا ہو گئی۔ اس میں قباحت یہ تھی کہ قبیلہ اوس کے لوگ ایک خزرجی کو اپنا سربراہ ماننا نہیں چاہتے تھے۔ اگر باہر کے کسی آدمی کو حکمران بنایا جاتا تو اسے دونوں قبائل تسلیم کر

لیتے۔ چنانچہ اس صورتحال نے بھی اسلام کی دعوت کی راہ ہموار کی۔ خزرج میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، انہوں نے یہی بات کہی: ”یارسول اللہ! امید ہے کہ اللہ تعالی ہمیں آپ کے ذریعے متحد کر دے گا۔“[4]

3۔ اوس اور خزرج کے عقائد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ بت پرستی میں مبتلا تھے مگر اس معاملے میں زیادہ کٹر نہیں تھے۔ اس کا اندازہ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے واقعے سے ہوتا ہے جو قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اپنے بت سے بہت محبت کرتے تھے۔ بعض نو مسلم نوجوان جو ان کے بھانجے بھتیجے تھے، نے شرارت یہ کی کہ ایک رات اس بت کو غلاظت میں پھینک دیا۔ اگلی صبح انہوں نے اس بت کو غلاظت میں پڑا پایا تو بہت غصے ہوئے اور اسے پاک صاف کر کے دوبارہ رکھا۔ اگلی رات ان نوجوانوں نے پھر یہی کیا اور صبح حضرت عمرو نے اسے پھر دھویا اور خوشبو لگائی۔ کچھ راتوں تک یہی ہوا۔ ایک رات تنگ آ کر حضرت عمرو نے تلوار اس بت کے پاس رکھی اور اس سے کہنے لگے: ”اگر تم میں واقعی کوئی خیر ہے تو پھر انہیں خود ہی روک لینا۔“ اگلی رات بھی جب لڑکوں نے یہی کیا تو ان کے ذہن میں معاملہ صاف ہو گیا اور انہوں نے توحید کا اقرار کر کے اسلام قبول کر لیا۔[5]

4۔ مدینہ منورہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور کردار سے اچھی طرح واقف تھے۔ چونکہ نبی کریم کا ننھیال مدینہ میں تھا، اس وجہ سے آپ کا ان سے مسلسل رابطہ رہا تھا۔ آپ کے اخلاق اور کردار کی بنیاد پر اہل مدینہ جان گئے کہ آپ اللہ تعالی کے سچے رسول ہیں۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بت پرستی کے معاملے میں اہل مدینہ زیادہ کٹر نہیں تھے۔

مدنی زندگی کے مختلف ادوار میں دعوتی اسٹریٹیجی

دعوتی حکمت عملی کے اعتبار سے مدنی زندگی کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- پہلا دور ہجرت نبوی سے پہلے کا ہے جو کہ 620-622 کے سالوں پر محیط ہے۔ اس دور میں اوس اور خزرج کے تقریباً سبھی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔
- دوسرا دور ہجرت نبوی سے لے کر صلح حدیبیہ (1-6/622-628) پر مشتمل ہے۔ اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گرد و نواح میں اپنی دعوت کو پھیلایا اور بہت سے دعوتی وفود مختلف قبائل کی طرف بھیجے۔ آپ نے مدینہ کے گرد و نواح میں آباد قبائل کے ساتھ صلح کے معاہدے کیے جن کی بدولت مسلم مبلغین کے لیے ان قبائل میں آنا جانا اور اپنی دعوت پیش کرنا ممکن ہوا۔
- تیسرا دور صلح حدیبیہ سے فتح مکہ (6-8/628-630) پر مبنی ہے۔ صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ کے جنوب میں آباد قبائل تک دعوت پہنچانا بہت مشکل تھا کیونکہ درمیان میں اہل مکہ موجود تھے جو مسلم قافلوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ صلح حدیبیہ سے یہ رکاوٹ ختم

ہوئی اور اس معاہدے کی شرائط کے تحت اہل مکہ اس معاملے میں غیر جانبدار ہو گئے کہ کوئی بھی قبیلہ اسلام قبول کرے۔ اس معاہدے کے بعد قبائل کی جانب دعوتی وفود میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا اور بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 5/627 میں مسلمانوں کے ہاں جو ان افراد کی تعداد 3000 تھی جو کہ فتح مکہ کے وقت 10,000 ہو چکی تھی۔ اصل آبادی کا اندازہ اس سے تین گنا کیا جا سکتا ہے۔

- چوتھا دور فتح مکہ سے لے کر وفات نبوی (8-11/630-632) کے درمیانی عرصے پر مشتمل ہے۔ اس میں تو اسلام کی دعوت بجلی کی تیزی سے پھیلتی چلی گئی اور صرف دو سال کے اندر اندر پورے جزیرہ نما عرب نے اسلام قبول کر لیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً 124,000 افراد نے شرکت کی اور اگر بالفرض اس حج میں شریک نہ ہونے والے ان سے پانچ گنا زیادہ ہوں تو اسلام قبول کرنے والوں کی کل تعداد آٹھ نو لاکھ کے قریب رہی ہو گی۔



جزیرہ نما عرب میں مختلف ادوار میں اسلام کی دعوت کا فروغ (بشکریہ سامی بن عبد اللہ الملغوث۔ ص 201)

عرب قبائل میں اسلام کی دعوت کے فروغ کے اسباب

مدینہ تشریف آوری کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو یہاں مسلم معاشرے کو مستحکم کیا اور اس کے ساتھ ہی متعدد دعوتی وفود مختلف قبائل کی طرف بھیجے۔ ان وفود میں سے بعض میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور بعض میں کسی صحابی کو سربراہ وفد بنا کر بھیجا۔ اول الذکر کو "غزوہ (جمع غزوات)" اور ثانی الذکر کو "سریہ (جمع سرایا)" کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ غلط فہمی موجود ہے کہ یہ سب کی سب جنگی مہمات تھیں۔ ایسا نہیں تھا بلکہ ان میں سے بعض غزوات و سرایا میں جنگ ہوئی اور بعض میں سفارتی

انداز میں قبائل کے ساتھ صلح کے معاہدے ہوئے۔ ان مہمات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ کے یہودی قبائل، قبیلہ جہینہ، بنو ضمرہ اور دیگر قبائل کے ساتھ دوستانہ تعلق قائم ہوا۔ اس کی بدولت یہ ممکن ہو سکا کہ اسلام کی دعوت کو ان قبائل میں پھیلایا جا سکے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک قبیلے کے سردار کی فرمائش پر ان مبلغین کو وہاں بھیجا جاتا۔ دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ دشمنوں نے انہیں بلا کر دھوکے سے شہید کر دیا۔ ایک مرتبہ سانحہ رجیع، جس میں بنو لحیان اور دوسری مرتبہ بئر معونہ میں ان مبلغین کو شہید کیا گیا۔ تاہم اکثر دعوتی مہمات کامیاب رہیں اور بہت سے لوگ دین میں داخل ہوئے۔ اس معاملے میں صحابہ کرام نے جس دعوتی جذبے کا مظاہرہ کیا، اس کی مثال نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ جن قبائل سے جنگ کا سامنا بھی ہوتا، انہیں بھی پہلے اسلام کی دعوت دی جاتی۔

اس کے علاوہ بعض قبائل ایسے بھی تھے، جن کے افراد نے مکی دور ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان میں قبیلہ دوس، ازد اور یمن کے بعض قبائل شامل تھے۔ اسلام قبول کرنے والے صحابہ نے اپنے اپنے قبیلے میں دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھا اور یہاں بھی لوگ آہستہ آہستہ اسلام لاتے رہے۔ اسی طرح حبشہ میں بھی دعوتی عمل جاری رہا اور وہاں بھی مسلم کمیونٹی پھلتی پھولتی رہی۔ 6/628 تک ہزاروں افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے آخر میں ایسا کیا معاملہ پیش آ گیا تھا کہ اسلام کی دعوت اس تیزی سے پھیلی۔ اگر ہم عہد نبوی کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد پہلے چھ سال تک اسلام اگرچہ ایک بڑی سیاسی قوت بن چکا تھا مگر ابھی اسے عرب میں فیصلہ کن حیثیت حاصل نہ تھی۔ عام عرب قریش کا احترام کرتے تھے اور ان کے نقطہ نظر کے مطابق کفار مکہ اور مدینہ ہجرت کرنے والے قبیلہ قریش ہی کے دو گروہ تھے جو کہ ان کے لیے یکساں قابل احترام تھے۔ اسلام کی دعوت کی سادگی انہیں متاثر کر رہی تھی اور ان کے سوچنے سمجھنے والے لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور ساتھ اپنے اپنے قبائل میں دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے تھے۔ بقیہ لوگ اس انتظار میں تھے کہ کفار مکہ اور مسلمانوں کی کشمکش کسی حتمی نتیجے تک پہنچ جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں، تو آپ فتح پا لیں گے اور یہی آپ کے سچا نبی ہونے کا ثبوت ہو گا۔ صلح حدیبیہ کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ اہل مکہ اب اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے، اس لیے اس موقع پر اسلام کے پھیلاؤ میں تیزی آئی۔ فتح مکہ کے بعد تو ان کی آنکھوں سے سب پردے ہٹ گئے اور یہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔

مدنی زندگی میں مکہ میں فروغ دعوت

مدینہ تشریف آوری کے بعد بھی مکہ میں اسلام کی دعوت کا عمل جاری رہا۔ اس میں خاص کر ان صحابہ نے اہم کردار ادا کیا جو کسی وجہ سے ہجرت کر کے مدینہ نہیں آ سکے تھے۔ یہ عمل خاص کر اس نسل میں تیزی سے جاری رہا جو عہد نبوی ہی میں پل کر جوان ہوئی۔ ان نوجوانوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے والدین اسلام کی شدید مخالفت کر رہے ہیں اور اس کے باوجود اسلام تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے تو ان کے ذہنوں میں اپنے پرانے مذہب سے متعلق سوالات پیدا ہوئے۔ دوسری طرف قرآن مجید ایک زندہ روایت بن کر ان کے ہاں

موجود تھا اور اس کی فصاحت و بلاغت نے شعرا اور خطبا کے چراغ گل کر دیے تھے۔ پھر انہوں نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئیوں کے عین مطابق اہل مکہ کو جنگ بدر میں شکست ہوئی اور ان کے تمام اسلام دشمن سردار مارے گئے۔ جنگ احد میں بھی اگرچہ انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا مگر اسلام کا خاتمہ نہ کر سکے۔ جنگ خندق میں بھی ان کی مہم ناکام رہی۔ صلح حدیبیہ کے بعد تو مکہ میں اسلام کی مخالفت میں بتدریج کمی آئی۔

اہل مکہ کی قیادت اب ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی جو اگرچہ اسلام کے مخالف تھے مگر اتنے کٹر نہیں تھے جس درجے میں ابوجہل اور ابولہب تھے۔ پوری مکی زندگی میں حضرت ابوسفیان نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں ستایا تھا۔ جنگ بدر کے بعد جب قیادت ان کے پاس آئی تو انہوں نے تین سال تک اسلام کی مخالفت کی لیکن اس کے بعد ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کی اپنی بیٹی سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بہت پہلے اسلام قبول کر کے حبشہ جا چکی تھیں۔ ان کے شوہر کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر کے انہیں مدینہ بلا لیا تو حضرت ابوسفیان کی مخالفت ختم ہو گئی اور ان کے اپنے بیٹے معاویہ رضی اللہ عنہ نے دل ہی دل میں اسلام قبول کر لیا اور صلح حدیبیہ کے موقع پر اسے رسول اللہ کے سامنے ظاہر بھی کیا۔[6]

اہل مکہ کے جو لوگ دوسرے ممالک میں تجارت یا سفارت کے لیے جایا کرتے تھے، وہ اس وقت اسلام سے بہت متاثر ہوئے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ نجاشی اسلام قبول کر چکے ہیں اور قیصر روم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرعوب ہے۔ اسلام کے کٹر دشمنوں ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل کے بیٹے خالد بن ولید اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے اسلام قبول کیا۔ دیگر سرداروں کے گھروں میں بھی اسلام داخل ہو چکا تھا۔ سہیل بن عمرو، جو کہ حدیبیہ میں کفار کی جانب سے معاہدہ کرنے آئے تھے، کے بیٹے ابو جندل رضی اللہ عنہما اسلام قبول کر چکے تھے۔

اس زمانے میں مکہ میں قحط پڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کھجوروں کے تھیلے بطور تحفہ بھیجے۔ اس سے بھی اہل مکہ کے دل پسیجے کہ اپنی قوم کے جس پیغمبر کی وہ شدت سے مخالفت کرتے رہے اور جنہیں ہر ممکن تکلیف انہوں نے پہنچائی، وہ ان کا کتنا خیال کر رہے ہیں۔ فتح مکہ، اہل مکہ کے کفر کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی جب بغیر کشت و خون کے مکہ فتح ہوا۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عجز و انکسار سے مکہ میں داخل ہوئے کہ آپ کا سر مبارک اونٹنی کے کوہان سے ٹکرا رہا تھا۔ آپ نے اہل مکہ کو اکٹھا کر کے خطبہ دیا اور فرمایا: ''آپ لوگ مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہیں؟'' انہوں نے عرض کیا: ''آپ کریم بھائی ہیں اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''پھر میں وہی بات آپ لوگوں سے کہوں گا جو حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ 'لا تثریب علیکم الیوم۔ آج آپ پر کوئی سرزنش نہیں'، جایئے، آپ آزاد ہیں۔'' اس کے بعد اہل مکہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔[7]

دعوتی حکمت عملی میں شادیوں کا کردار

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح
- مشرک سے نکاح کی ممانعت کے اثرات

نکاح سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی پر ایک دوسرے کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی جن خواتین سے ہوئی تو وہ سب دین پر خلوص کے ساتھ عمل کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے اثرات اپنی فیملی اور قبیلے پر ہوئی کہ وہ قبیلے بھی ایمان لائے۔

اس کی مثال آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہوئی تو ان کے والدین ابو سفیان اور والدہ ھند رضی اللہ عنہما ایمان لائے۔ اسی طرح سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں اور شادی کی تو پھر ان کا پورا قبیلہ ایمان لایا۔ سیدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا تعلق مصر سے تھا اور وہ ایمان لائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی ہوئی تو کچھ عرصے بعد مصر کی اکثریت بھی ایمان لائی۔

جو خاتون یا مرد کا دین مختلف تھا تو اس لیے مشرکین سے شادی کو ختم کرنے کا حکم دیا کیونکہ مشرک شوہر کے اثرات اہل ایمان خاتون پر ہو سکتی تھی۔ اسی طرح مشرک بیوی کے اثرات شوہر پر بھی ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین کے ساتھ شادی کو ختم کر دیا۔ جو بھی ایمان لائے تو مشرک سے نکاح کینسل ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر ابو العاص ابھی مشرک تھے تو ان سے نکاح کینسل ہو گیا۔ ہاں کچھ سال بعد ان کے شوہر ایمان لائے تو پھر رشتہ قائم ہو گیا۔

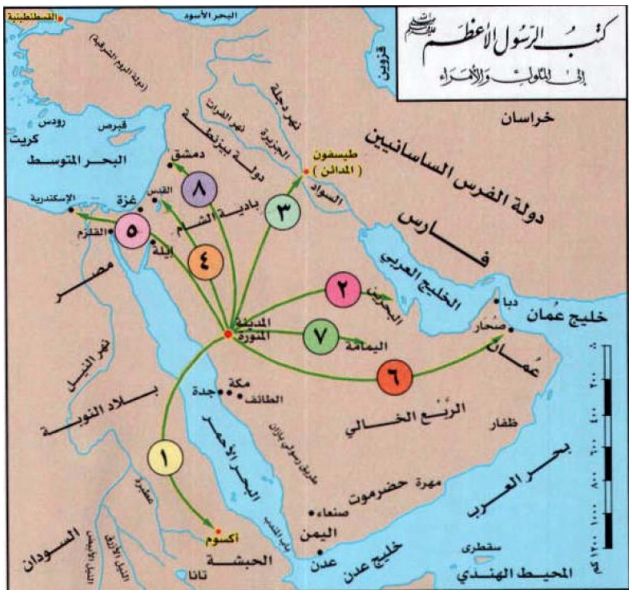
انٹرنیشنل سطح پر دعوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کی ابتدا ہی میں یہ واضح فرما دیا تھا کہ آپ کی دعوت کا اسکوپ تمام نسل انسانیت تک محیط ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ.

ہم نے تو آپ کو تمام انسانوں کی طرف بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔ (سبا 34:28)

اسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث میں واضح فرمایا ہے: ''نبی کو اپنی قوم کی طرف ہی خاص طور پر بھیجا جاتا ہے مگر مجھے تمام انسانوں کی طرف عمومی طور پر بھیجا گیا ہے۔''[8]



بشکریہ: شوقی ابو خلیل، اطلس السیرۃ النبویہ۔ ص163

عہد نبوی میں صورتحال یہ تھی کہ جزیرہ نما عرب کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں ایران اور روم کی دو بڑی قوتیں موجود تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ چھوٹی ریاستیں بھی عرب کے گرد و نواح میں موجود تھیں۔ فطری طور پر اسلام کی دعوت کو پہلے انہی تک پہنچنا تھا اور اس کے بعد دیگر علاقوں میں اسے پہنچایا جانا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی طور پر جزیرہ نما عرب اور اس کے گرد و نواح کے حکمرانوں کو خطوط لکھے، جن میں روم کا بادشاہ ہرقل، ایران کا بادشاہ خسرو پرویز، حبشہ کا بادشاہ نجاشی، مصر کا بادشاہ مقوقس، بحرین کا بادشاہ منذر بن ساوی، یمامہ کا قبائلی لیڈر ہوذہ بن علی، عمان کے دو بادشاہ جیفر اور عبد، اور غسان کا بادشاہ حارث شامل تھے۔

دعوتی نقطہ نظر سے مکاتیب نبوی کا تجزیہ

ان خطوط کے حوالے سے ہمیں کچھ امور کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے: ایک تو یہ کہ ان خطوط میں دین کی دعوت کس طرح سے دی گئی تھی؟ دوسرے یہ کہ ان حکمرانوں نے کیا ردعمل ظاہر کیا اور اس کے اسباب کیا تھے؟ سب سے پہلے تو ہم ان خطوط کے مضامین کا تجزیہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان خطوط کی دعوتی اہمیت کیا تھی۔ یہاں ہم بطور مثال تین خطوط پیش کر رہے ہیں جو بالترتیب قیصر روم، کسری ایران اور نجاشی کے نام لکھے گئے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی جانب سے حبشہ کے سربراہ نجاشی کے نام۔

اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی اختیار کرے۔ امابعد۔ میں آپ کے سامنے اللہ کی حمد بیان کر رہا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جو قدوس اور سلام ہے، امن دینے والا اور محافظ و نگران ہے۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ عیسی بن مریم اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں۔ اللہ نے پاکیزہ اور پاکدامن مریم بتول کی طرف ڈال دیا تھا اور اس کی روح اور پھونک سے مریم عیسی کے لیے حاملہ ہوئیں۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے اللہ نے آدم کو براہ راست پیدا فرمایا۔ میں اللہ وحدہ لاشریک لہ کی جانب سے اور اس کی اطاعت کے لیے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے

کی مدد کریں۔ میں آپ کو اس بات کی طرف بلاتا ہوں کہ آپ میری پیروی کیجیے اور جو کچھ میرے پاس آیا ہے، اس پر ایمان لائیے کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں آپ اور آپ کے لشکر کو اللہ عزوجل کی طرف بلا رہا ہوں اور میں نے خیر خواہی کے ساتھ پیغام پہنچا دیا ہے، لہذا میری نصیحت قبول کیجیے۔ سلام ہو اس شخص پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔[9]

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی جانب سے روم کے بادشاہ ہرقل کے نام۔

اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے۔ آپ اسلام لے آیئے، صحیح وسلامت رہیں گے۔ اگر آپ اسلام لائیں گے تو اللہ آپ کو دوگنا اجر عطا فرمائے گا۔ اگر آپ نے روگردانی کی تو آپ کی رعایا کا گناہ بھی آپ پر ہو گا۔ "اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آیئے جو ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور نہ ہی اللہ کے سوا ایک دوسرے کو رب بنائیں۔ پھر اگر یہ لوگ رخ پھیریں تو کہیے: گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔"[10]

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی جانب سے ایران کے بادشاہ کسری کے نام۔

اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں ہے۔ وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں آپ کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں کیونکہ میں تمام انسانوں کی جانب اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ جو شخص زندہ ہے، اسے برے انجام سے خبردار کر دیا جائے اور کافروں پر حق بات کو واضح کر دیا جائے۔ پس اگر آپ اسلام لے آئیں تو صحیح سلامت رہیں گے اور اگر آپ نے اس سے انکار کیا تو آپ پر مجوس کے گناہوں کا بوجھ ہو گا۔[11]

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ نجاشی اور قیصر چونکہ عیسائی تھے، اس لیے انہیں لکھے گئے خطوط میں اہل کتاب کے ساتھ مشترک عقائد کی اپیل موجود ہے۔ اس کے برعکس کسری چونکہ مجوسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے اس کو لکھے گئے خط میں یہ اپیل نہیں ہے بلکہ فوکس اس بات پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی نوعیت عالمی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم نے ان خطوط میں مخاطب کی نفسیات اور بیک گراؤنڈ کا خاص خیال رکھا تھا جو کہ دعوتی حکمت عملی کا لازمی تقاضا ہے۔

اگر ہم خالص دعوتی نقطہ نظر سے ان خطوط کا تجزیہ کریں تو چند سوال پیدا ہوتے ہیں:

- جب ایک اجنبی شخص کے سامنے ایک ایسے دین کی دعوت پیش کی جاتی ہے جس سے وہ ناواقف ہو تو خاصی تفصیل سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر دعوت کے نتیجے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا جواب دیا جاتا ہے اور مخاطب کو ہر طرح سے مطمئن کیا جاتا ہے۔ ان بادشاہوں کو اتنے مختصر خطوط کیوں لکھے گئے جن میں بات واضح نہیں ہے؟ اور ان کے سوالات کے جواب کیسے دیے گئے؟
- سوائے نجاشی کو لکھے گئے خط کے، بقیہ خطوط کی زبان دعوتی نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ الٹی میٹم سا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

- یہ خطوط 629-628/7-6ہی میں کیوں لکھے گئے؟ اس سے پہلے یا بعد میں کیوں نہیں؟

جہاں تک خطوط کے مختصر ہونے کا تعلق ہے تو اس کے جواب کے لیے ہمیں عہد قدیم کے سفارتی طریقوں (Diplomacy) کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اس زمانے میں قاصد کی حیثیت محض پوسٹ مین یا ڈاکیے کی نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ وہ ایک بااختیار اور صاحب علم و دانش سفیر ہوا کرتا تھا۔ خط کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اس میں بنیادی بات کہہ دی جائے، بقیہ تفصیلات قاصد کی زبانی پہنچائی جاتی تھیں۔ جن صحابہ کو قاصد بنا کر بھیجا گیا، وہ وہی تھے جن کے متعلقہ بادشاہوں کے دربار میں تعلقات تھے۔ یہ نہایت ہی صاحب علم و دانش لوگ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن سے اچھی طرح واقف تھے۔ خطوط پیش کرنے سے پہلے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا پورا بیک گراؤنڈ بیان کیا اور اس کے بعد ہی خط پیش کیا۔ ضروری نہیں کہ یہ سب تفصیلات براہ راست بادشاہ ہی کو بتائی گئی ہوں بلکہ یہ سب کچھ متعلقہ عہدے داروں نے پہلے معلوم کر کے بادشاہ کو بتایا ہو گا۔ پھر بادشاہوں کے ذہنوں میں جو سوالات اٹھے ہوں گے، ان کے جواب قاصدوں سے حاصل کیے ہوں گے۔ اس کے بعد خط پیش کرنے کی رسمی کاروائی کی گئی ہو گی۔ مورخین نے بعض قاصدوں کی تقاریر بھی نقل کی ہیں، جو انہوں نے اس دعوت کا بیک گراؤنڈ بیان کرتے ہوئے بادشاہوں کے دربار میں کیں۔ اس کی مثالیں آگے آ رہی ہیں۔

یہ سوال کہ خطوط کی زبان دعوتی سے زیادہ الٹی میٹم کی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ "نذیر" کا تھا جس کا مطلب ہے خبردار کرنا۔ اللہ تعالی کے قانون دینونت کے تحت پیغمبر کے براہ راست مخاطبین اگر ایمان نہ لائیں تو انہیں اسی دنیا میں سزا دے دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان بادشاہوں کو خبردار کیا کہ اگر وہ ایمان لے آئیں گے تو صحیح و سلامت رہیں گے ورنہ اسی دنیا میں انہیں سزا دے دی جائے گی۔ اہل کتاب چونکہ اللہ تعالی کے اس قانون سے اچھی طرح واقف تھے، اس وجہ سے قیصر روم کے یہ الفاظ صحیح بخاری میں نقل ہوئے ہیں: "جو کچھ آپ لوگ کہہ رہے ہیں، اگر یہ حق ہے تو پھر عنقریب یہ پیغمبر اس جگہ کے مالک ہو جائیں گے جو میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہے۔"[12]

جہاں تک ان خطوط کی ٹائمنگ کا تعلق ہے تو اس کی ایک خاص اہمیت تھی۔ یہ خطوط 629-628/7-6 میں بھیجے گئے۔ اس سے پہلے اسلام صرف مدینہ کی چھوٹی سی شہری ریاست پر مشتمل تھا اور اس کے فوراً بعد یہ ریاست صرف تین سال کے عرصے میں پورے جزیرہ نما عرب میں پھیلتی چلی گئی۔ خطوط لکھے جانے کے زمانے میں مدینہ منورہ کی ریاست ایک مختصر سے رقبے پر محیط تھی جو مدینہ شہر اور اس کے اطراف میں زیادہ سے زیادہ سو دو سو کلومیٹر پر محیط تھا۔ اس کے مقابلے میں جن بادشاہوں کو خطوط بھیجے گئے، وہ سب کے سب بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک تھے جو کہ لاکھوں مربع کلومیٹر پر مشتمل تھیں۔ اگر یہ خطوط پہلے بھیجے جاتے تو شاید قیصر و کسری کے درباروں میں رسائی ہی نہ ہوتی اور انہیں سنجیدگی سے نہ لیا جاتا۔ اگر یہ بعد میں بھیجے جاتے ان بادشاہوں پر اتمام حجت (یعنی آخری درجے میں حق کی وضاحت) ہونا مشکل ہوتا۔

اگر ہم اللہ تعالی کے قانون دینونت اور خطوط میں دیے گئے الٹی میٹم کو پیش نظر رکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ ان خطوط سے چونک پڑے ہوں گے کہ ہم سے کہیں چھوٹی ریاست کا سربراہ ہمیں اس نوعیت کے خطوط لکھ رہا ہے اور ساتھ یہ پیش گوئی کر رہا ہے کہ وہ عنقریب اپنے مخاطبین پر نہ صرف غالب آنے والا ہے بلکہ روم و ایران کی فتح کی پیش گوئیاں اپنے ساتھیوں کو سنا رہا ہے۔ ان خطوط کے صرف تین سال کے عرصے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں غلبہ عطا ہو گیا اور آپ کی پیش گوئی پوری ہو گئی تو یہ اس بات کا بالکل واضح ثبوت تھا کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں۔ خطوط بھیجے جانے کا مقصد یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریاست کا تین سال تک مشاہدہ کریں اور جب تھوڑے سے وقت میں آپ کو غلبہ مل جائے تو یہ ان بادشاہوں پر اتمام حجت ہو گا کہ ان سے اللہ کا ایک سچا رسول مخاطب ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن بادشاہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا، انہیں اسی دنیا میں یہ سزا دی گئی کہ وہ اپنی سلطنتوں سے محروم ہو گئے اور جنہوں نے اس دعوت کو قبول کیا، انہیں اسی دنیا میں سرفرازی حاصل رہی۔

بادشاہوں کا ردعمل

ان بادشاہوں کا ردعمل ملا جلا تھا۔ پہلے ہم اس کا خلاصہ بیان کریں گے اور پھر ایک ایک بادشاہ کو لے کر اس کی تفصیل بیان کریں گے:

- حبشہ، بحرین اور عمان کے بادشاہوں نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے اپنے علاقوں کی حکومت پر بر قرار رکھا۔
- روم اور مصر کے بادشاہ احترام سے پیش آئے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحفے بھی بھیجے۔ اس وقت اہل مکہ کا ایک قافلہ حضرت ابوسفیان کی قیادت میں شام آیا ہوا تھا۔ قیصر روم ہرقل نے انہیں بلا کر ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال کیے اور اس بات پر مطمئن ہو گیا کہ آپ سچے رسول ہیں تاہم اپنے ساتھیوں کی ناراضی کے سبب ایمان نہیں لایا۔
- یمامہ کے حاکم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائش کی کہ اگر اسے شریک اقتدار کر لیا جائے تو وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہے مگر اس غیر مخلصانہ پیشکش کو حضور نے قبول نہیں فرمایا۔
- ایران کے بادشاہ نے بہت بد تمیزی کی، خط مبارک چاک کر دیا اور یمن کے ایرانی گورنر کو حکم دیا کہ وہ مدینہ پر حملہ کر دے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کرے۔
- غسان کے بادشاہ نے بھی بد تمیزی کی اور مدینہ پر حملہ کا ارادہ ظاہر کیا۔[13]

نجاشی شاہ حبشہ

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شاہ حبشہ نجاشی، جن کا اصل نام "اصحمہ" تھا، کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے خصوصی لگاؤ تھا اور انہوں نے مسلم مہاجرین کو پناہ دے کر آپ کی عملی حمایت کر رکھی تھی۔ نجاشی ایک لقب تھا اور حبشہ کا ہر بادشاہ نجاشی ہی کہلاتا تھا۔ مسلم مہاجرین نے اس کا بدلہ یہ دیا کہ کچھ ہی عرصے بعد نجاشی کی اپنے دشمنوں سے جنگ چھڑ گئی۔ اس میں مسلمانوں نے نجاشی کی بھرپور حمایت کی اور عملی امداد کا یقین دلوایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نامہ مبارک حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھیجا۔ حضرت عمرو کے زمانہ جاہلیت ہی سے نجاشی اور ان کے خاندان سے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے نجاشی کے سامنے جو تقریر کی، اس کا متن یہ ہے:

اے بادشاہ! میرے ذمہ حق بات پہنچا دینا ہے اور آپ کے ذمہ حق بات سننا۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پچھلے کچھ عرصے سے ہم پر آپ کی شفقت اور محبت کا یہ عالم ہے کہ گویا آپ اور ہم ایک ہی ہیں۔ ہم کو بھی آپ پر اس درجے میں اعتماد ہے کہ ہم آپ کو کسی طرح خود سے الگ نہیں سمجھتے۔ ہم نے جس بھلائی کی امید آپ سے کی، وہ پائی اور جس خطرے کا اندیشہ کیا، اس سے محفوظ رہے۔ ہماری طرف سے آپ کے لیے حضرت آدم کی تخلیق ایک قطعی دلیل ہے۔ یعنی جس قدرت کے کرشمہ ساز ہاتھوں نے حضرت آدم (علیہ الصلوۃ والسلام) کو بغیر والدین کے مٹی سے پیدا کر دیا، اسی نے حضرت عیسی (علیہ الصلوۃ والسلام) کو بغیر باپ کے ماں کے پیٹ سے پیدا کر دیا۔ "اللہ کے نزدیک عیسی کی مثال آدم کی سی ہے۔ آدم کو اس نے مٹی سے پیدا کیا اور پھر ان سے کہا: (زندہ) ہو جاؤ تو وہ ہو گئے۔"

ہمارے اور آپ کے درمیان انجیل وہ گواہ ہے، جس کی گواہی کبھی مسترد نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ حاکم ہے، جس سے ظلم کا امکان نہیں۔ اس نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی ہی میں خیر و برکت اور فضیلت و بزرگی حاصل ہو سکتی ہے۔ اے بادشاہ! اگر آپ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی نہ کی تو ان نبی امی کا انکار آپ کے لیے اسی طرح باعث وبال ہو گا جیسا کہ یہود کے لیے حضرت عیسی (علیہ الصلوۃ والسلام) کا انکار ثابت ہوا۔ میری طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے دیگر افراد کو مختلف بادشاہوں کی طرف اسلام کی دعوت کے سفیر بن کر گئے ہیں مگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آپ سے جو امید ہے، ویسی کسی اور سے نہیں ہے۔ انہیں دوسروں سے جس بات کا اندیشہ ہے، آپ کے بارے میں انہیں مکمل اطمینان ہے کہ آپ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان گزشتہ نیکیوں اور آئندہ کے اجر و ثواب کا خیال رکھیں گے۔

نجاشی اصحمہ نے جب حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہما کی یہ تقریر سنی تو جواب میں کہا:

عمرو! واللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے وہی جلیل القدر پیغمبر ہیں جن کی آمد کا انتظار اہل کتاب کر رہے ہیں۔ بے شک موسی (علیہ الصلوۃ والسلام) کا گدھے کی سواری کرنے والے عیسی (علیہ الصلوۃ والسلام) کی بشارت دینا بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ عیسی نے اونٹ کی سواری کرنے والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بشارت دی ہے۔ دونوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے اور اس بارے میں میرے لیے آپ کا براہ راست مشاہدہ اور (دوسرے کی دی ہوئی) خبر برابر ہیں۔ مگر اہل حبشہ میں میرے مددگار بہت کم ہیں۔ اس لیے آپ مجھے اتنی مہلت دیجیے کہ میں اپنی قوم میں اپنے کافی مددگار اور ان کے دلوں میں نرمی پیدا کر لوں۔[14]

نجاشی اصحمہ رضی اللہ عنہ نے نامہ مبارک کا اتنا احترام کیا کہ اسے چوم کر سر پر رکھا اور پھر تخت سے نیچے اتر کر مترجم سے اس خط کو سنا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اگرچہ حبشہ میں بعض عیسائی اسلام قبول کر چکے تھے مگر اکثریت ابھی سختی سے اپنے مذہب پر قائم تھی۔ انہوں نے بغاوت کا ارادہ کیا تو حضرت اصحمہ نے حکمت عملی سے اپنے اسلام کو ان سے چھپالیا اور اس طرح بغاوت کا یہ خطرہ ٹل گیا۔ اصحمہ نے اپنے بیٹے کو 60 ساتھیوں کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا مگر راستے میں طوفان سے یہ کشتیاں ڈوب گئیں اور یہ سب لوگ وفات پا گئے۔[15] اس وقت حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی قریش کے سفیر کے طور پر وہاں آئے ہوئے تھے۔ نجاشی نے انہیں بھی ایمان لانے پر قائل کیا اور اس کے چھ ماہ بعد حضرت عمرو بن عاص بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کے ساتھ مدینہ حاضر ہو کر ایمان لے آئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت اصحمہ کا انتقال ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ مدینہ میں پڑھائی اور فرمایا: ''ایک نیک شخص کا انتقال ہو گیا ہے، اٹھیے اور اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ پڑھیے۔''[16] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے نجاشی کو بھی دعوتی خط لکھا جس کا مضمون کم و بیش وہی تھا جو کہ قیصر روم کو لکھے گئے خط کا تھا۔ اس نجاشی کے رد عمل کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا ہے۔[17] تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے نجاشی نے بھی دوستانہ رویہ اختیار کیا۔ اسی وجہ سے نبی کریم نے اپنے صحابہ کو یہ حکم دیا کہ وہ حبشہ پر اس وقت تک حملہ نہ کریں جب تک اہل حبشہ خود مسلمانوں سے جنگ نہ کریں۔[18] نجاشی کے اسی رد عمل کے سبب اہل حبشہ کو یہ استثنا دیا گیا اور یہاں صحابہ کرام نے لشکر کشی نہیں کی۔

قیصر روم

قیصر روم کا نام ہرقل (Heraclius r. 610-641) تھا۔ یہ نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ تورات و انجیل کا بڑا عالم بھی تھا۔ اسی وجہ سے یہ اللہ تعالی کے قانون دینونت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اس نے ایران کی عظیم سپر پاور کو شکست دے کر رومن ایمپائر کے علاقے اس سے آزاد کروائے تھے۔ اس کے زمانے میں رومن ایمپائر موجودہ یونان، ترکی، شام، لبنان، فلسطین، اردن، عراق، لیبیا اور الجیریا تک پھیلی ہوئی تھی اور مصر بھی اسی کا ایک نیم خود مختار صوبہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ گئے اور پہلے جنوبی شام کے گورنر سے ملاقات کی۔ اس نے آپ کو قیصر کے پاس بھجوا دیا جو کہ اس وقت زیارت کی غرض سے بیت المقدس (یروشلم) آیا ہوا تھا۔

قیصر روم کو جب حضرت دحیہ نے تفصیلات بتائیں تو اس نے تحقیق کی غرض سے حکم دیا کہ کوئی عرب باشندے وہاں ہوں تو انہیں حاضر کیا جائے۔ اس وقت حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں آئے ہوئے تھے۔ آپ ابھی ایمان نہیں لائے تھے اور کفار مکہ کے سربراہ تھے۔ صحیح بخاری میں انہی کی بیان کردہ روایت موجود ہے کہ انہیں ان کے ساتھیوں سمیت ہرقل کے دربار میں لایا گیا۔ ہرقل نے پوچھا: ''آپ لوگوں میں پیغمبری کا دعوی کرنے والے ان صاحب کے قریبی رشتہ دار کون ہیں؟'' اس پر حضرت

ابوسفیان آگے بڑھے اور ہرقل نے اپنے مترجم کے ذریعے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب، اخلاق، کردار، پیروکاروں اور جدوجہد کے متعلق سوالات کیے اور پھر کہا:

میں نے ان صاحب (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی خاندانی شرافت کے متعلق اس لیے پوچھا کہ پیغمبر ہمیشہ محترم سمجھے جانے والے خاندان ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے یہ جو پوچھا کہ ان کے خاندان میں کسی نے پہلے نبوت کا دعوی کیا ہے تو آپ نے بتایا کہ نہیں۔ اگر آپ ہاں کہتے تو میں سمجھ لیتا کہ یہ صاحب اپنے خاندان کے دعوی کی تقلید کر رہے ہیں۔

میں نے یہ پوچھا کہ ان کے خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے تو آپ نے اس کا بھی نفی میں جواب دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھ لیتا کہ یہ اپنے آباؤ اجداد کی حکومت کے طالب ہیں۔

میں نے یہ پوچھا کہ اس سے پہلے آپ لوگوں نے کبھی ان پر جھوٹ کا الزام لگایا ہے تو آپ نے کہا نہیں۔ میں اس بات کو جان گیا ہوں کہ جو شخص لوگوں کے بارے میں جھوٹ نہیں بولتا، وہ اللہ پر کیسے جھوٹ باندھ سکتا ہے؟

میں نے آپ سے یہ پوچھا کہ طاقتور لوگ ان کی پیروی کر رہے ہیں یا کمزور، تو آپ نے کہا کہ کمزور۔ رسولوں کے ابتدائی پیروکار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں تو آپ نے بتایا کہ بڑھ رہے ہیں۔ ایمان کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ تکمیل تک بڑھتا ہے۔

میں نے آپ سے یہ پوچھا کہ کیا کوئی شخص ان کے دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے نفرت کے سبب نکل گیا ہے تو آپ نے کہا کہ نہیں۔ ایمان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے وہ دل میں اطمینان پیدا کرتا ہے۔

میں نے آپ سے پوچھا کہ کیا وہ کبھی وعدہ خلافی کرتے ہیں تو آپ نے بتایا کہ نہیں۔ رسول ایسے ہی ہوتے ہیں اور کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔

میں نے آپ سے ان کی تعلیمات کے بارے میں پوچھا تو آپ نے بتایا کہ وہ اللہ کی عبادت کی تلقین کرتے ہیں اور شرک سے منع کرتے ہیں۔ بتوں کی عبادت سے روکتے ہیں، آپ لوگوں کو نماز، سچائی اور عفت و عصمت کی تلقین کرتے ہیں۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، اگر وہ سچ ہے تو عنقریب وہ اس مقام کے مالک ہوں گے جو اس وقت میرے قدموں تلے ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ظاہر ہونے والے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ آپ لوگوں مین سے ہوں گے۔ اگر میں یہ جانتا تو خود کو ان کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا اور ان سے ملنے کے لیے ہر مشکل برداشت کرتا۔ اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے پاؤں دھوتا۔[19]

ہرقل کی اس گفتگو سے ابوسفیان بڑے متاثر ہوئے اور کہنے لگے: ''ابن ابی کبشہ کا معاملہ تو بڑا پھیل گیا ہے کہ رومیوں کا بادشاہ بھی ان سے خوفزدہ ہے۔'' اس کے بعد ہرقل نے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو قسطنطنیہ بھیجا تاکہ وہ وہاں کے پوپ کو دعوت دیں۔ ان صاحب کا صغاطر تھا۔ انہوں نے جب حضرت دحیہ سے گفتگو کی تو انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا نبی ہونے کا یقین ہو گیا۔ انہوں نے دیگر پادریوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت کی جس پر وہ سب ان پر پل پڑے اور انہیں شہید کر دیا۔[20] ہرقل نے بھی

کوشش کی کہ وہ اپنے عمائدین سلطنت کو قبول اسلام پر قائل کر سکے مگر انہوں نے شدید مخالفت کی جس کی وجہ سے ہرقل نے قبول اسلام کا ارادہ ترک کر دیا۔[21] اس کے کچھ عرصہ بعد ہرقل جنگ موتہ میں ایک لشکر مسلمانوں کے مقابلے پر لے آیا۔ صرف چند برس کے بعد 650-636/27-14 میں ہرقل کو اپنے ایشیائی اور افریقی مقبوضات سے ہاتھ دھونا پڑے۔

مقوقس شاہ مصر

مصر کے بادشاہ کو مقوقس کہا جاتا تھا۔ یہ قیصر روم کے ماتحت ایک نیم خود مختار بادشاہ تھا۔ اس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ مقوقس نے ان سے متعدد سوالات کیے، ان کے ساتھ احترام سے پیش آیا اور ان کی بہت خاطر مدارت کی۔ واپسی پر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ایک خط بھیجا اور اس کے ساتھ ہی دو معزز خواتین اور بہت سے تحفے بھیجے۔ حضرت حاطب کی دعوت کے نتیجے میں ان خواتین نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے ایک خاتون سیدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو امہات المومنین میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ تاہم مقوقس نے اسلام قبول اس وجہ سے نہ کیا کہ وہ قیصر روم کا تابع تھا اور اس کی مخالفت مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

جب مسلم افواج نے شام فتح کیا تو مصر میں تھوڑی سی نمائشی مزاحمت کے بعد مقوقس نے اسے مسلمانوں کے حوالے کر دیا اور اپنی قوم کے لیے امان چاہی۔ فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے انہیں اور پوری قبطی قوم کو امان دے دی اور اس طرح مصر معمولی سی مزاحمت کے بعد اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا۔[22]

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں عیسائی بادشاہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصدوں کا احترام کیا مگر سوائے حضرت اصحمہ رضی اللہ عنہ کے، کسی اور ایمان لانے کی توفیق نہ ہوئی۔

شاہان غسان

آپ پڑھ چکے ہیں کہ اہل غسان اصلاً عرب ہی تھے مگر انہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا اور یہ قیصر روم اور عربوں کے درمیان ایک بفر اسٹیٹ چلا رہے تھے اور قیصر کے حلیف تھے۔ ان کی حکومت موجودہ سعودی عرب کے انتہائی شمالی اور اردن کے جنوبی علاقوں پر قائم تھی اور اس کی حیثیت رومن ایمپائر کے ایک نیم خود مختار صوبے کی تھی۔ ان میں سے ایک حاکم حارث نے خاصی بد تمیزی کی اور مدینہ پر حملے کی تیاریاں کرنے لگا مگر قیصر روم نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ دوسرے حاکم جبلہ بن ایہم نے قاصد کی خاطر مدارت کی اور اسلام میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ یہ شخص ایمان بھی لے آیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک معمولی واقعے سے دلبرداشتہ ہو کر مرتد ہو گیا اور قیصر روم کے پاس چلا گیا۔[23]

کسری شاہ ایران

شاہ ایران خسرو پرویز (r. 590-628) کو حضرت عبد اللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک پہنچایا۔ اس نے نہایت ہی بد تمیزی کی اور تکبر سے پیش آیا۔ اس کے زمانے میں یمن ایران کے ماتحت تھا۔ خسرو نے یمن کے وائسرائے باذان کو لکھا کہ وہ دو افراد مدینہ بھیج کر تحقیق کروائے۔ باذان کے یہ دونوں قاصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو آپ نے انہیں خبر دی کہ خسرو کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا ہے۔ یہ دونوں واپس باذان کے پاس آئے تو ان کی اطلاعات سے باذان کو یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں چنانچہ وہ ایمان لائے اور اس طرح یمن اسلامی حکومت کے تحت آ گیا۔ چند ہی سال بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران فتح ہو کر عالم اسلام میں داخل ہو گیا اور کسری کی حکومت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

جزیرہ نما عرب کے بادشاہ

جزیرہ نما عرب کے مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں۔ ان میں وسطی عرب میں یمامہ، مشرقی عرب میں بحرین، عمان اور یمن کے علاقے کی بعض چھوٹی موٹی ریاستیں تھیں۔ یمن کے بعض ساحلی علاقوں پر اگرچہ ایران کا کنٹرول تھا لیکن اندرونی علاقوں میں کچھ مقامی ریاستیں تھیں۔ یمامہ کے حکمران نے اس شرط پر اسلام قبول کرنے کا وعدہ کیا کہ اسے بھی حکومت میں شریک کیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول نہیں فرمایا۔ بحرین کے حاکم منذر بن ساویٰ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ موجودہ جزیرہ بحرین نہیں بلکہ سعودی عرب کے مشرقی علاقے پر مشتمل علاقہ تھا۔

عمان پر دو بھائیوں جیفر اور عبد کی حکومت تھی۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر بھیجا اور ان کی کوششوں سے ان دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یمن کے بعض علاقوں پر اب بھی حمیری بادشاہوں کی نسل کے بعض سرداروں کی حکومت تھی۔ ان میں ذو الکلاع، ذو عمرو اور مالک بن مرارہ نامی سردار ایمان لائے۔ یمن کے مشہور شہر حضر موت کے سردار وائل بن حجر بھی مدینہ حاضر ہو کر ایمان لائے۔ رضی اللہ عنہم۔[24]

کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن بادشاہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا، ان کے خلاف فوجی کاروائی کیوں کی گئی؟ کیا اس طرح اسلام تلوار سے نہیں پھیلایا گیا؟ اس کے لیے ہمیں ایک بار پھر قانون دینونت کے چند پہلوؤں کو سمجھنا ہو گا۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالی کے قانون دینونت کے مطابق رسول کے براہ راست مخاطبین کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اتمام حجت کے بعد ان پر عذاب آ جاتا ہے۔ اتمام حجت کا مطلب ہے کہ دلائل کی مدد سے رسول کی رسالت کو اس درجے میں واضح کر دیا جائے کہ انکار کرنے

والوں کے پاس سوائے ضد اور ہٹ دھرمی کے، اور کوئی دلیل نہ بچے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں غلبہ حاصل ہو گیا تو یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ آپ اللہ تعالی کے سچے پیغمبر ہیں۔ اس کے بعد ان بادشاہوں کے پاس اور کوئی دلیل نہ تھی کہ وہ آپ کا انکار کرتے۔ اوپر بیان کردہ واقعات سے واضح ہے کہ ان میں سے خاص کر اہل کتاب بادشاہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے قائل ہو چکے تھے۔ جنہوں نے مان لیا، انہیں ان کی حکومتوں پر برقرار رکھا گیا اور جنہوں نے نہیں مانا، انہیں اسی دنیا میں سزا یہ ملی کہ ان کے علاقوں سے انہیں محروم کر دیا گیا۔

اس کی دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں مذہبی جبر (Religious Persecution) کا غلبہ تھا۔ کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے بادشاہ کے مذہب کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا مقصد اس وقت کی متمدن دنیا کے مرکز میں ایک ایسی ریاست کا قیام تھا جہاں ہر شخص اپنے عقیدے اور مذہب کے مطابق زندگی بسر کر سکے اور اگر کوئی اسلام قبول کرنا چاہے تو اسے کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی بادشاہتوں کو ختم کر کے ان کی جگہ ایک دینی ریاست قائم کی گئی۔

مفتوحہ علاقوں میں کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اس کا زندہ ثبوت شام، اردن اور عراق میں رہنے والے وہ غیر مسلم ہیں جو آج تک وہاں آباد ہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اسلام کے قبول کرنے کی راہ میں جو حکومتی جبر حائل تھا، اس کا قلع قمع تلوار کے ذریعے کیا گیا۔

---

[1] خالد مسعود۔ ایضا۔ ؟؟؟

[2] بخاری۔ کتاب المناقب۔ حدیث 3656

[3] ابن ہشام بحوالہ مبارک پوری۔ 195

[4] ایضا۔ 196

[5] ابن ہشام۔ باب بدء اسلام الانصار۔

[6] ابن عساکر۔ تاریخ دمشق۔ 59/105۔ بیروت: دار الفکر۔

[7] مبارک پوری۔ 551

[8] بخاری۔ کتاب التیمم۔ حدیث 328

[9] مبارک پوری۔ 477

[10] ایضا۔ 483

[11] ایضا۔ 482

[12] بخاری۔ کتاب بدء الوحی۔ حدیث 7

[13] الازہری۔ 4/181-204

[14] محمد حفظ الرحمن سیوہاروی۔ بلاغ المبین یعنی مکاتیب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔ ص80۔ سیوہارہ: مکتبہ اسلامیہ۔

[15] ایضا۔85

[16] بخاری۔ کتاب المناقب۔ حدیث3664

[17] سیوہاروی۔199

[18] نسائی۔ کتاب الجہاد۔ حدیث3176

[19] بخاری۔ کتاب بدء الوحی۔ حدیث7

[20] طبری۔ تاریخ الرسل والملوک۔2/650۔ مصر: دار المعارف

[21] بخاری۔ ایضا۔

[22] سیوہاروی۔147-152

[23] سیوہاروی۔165-173

[24] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے، سیوہاروی۔160-205

سیکشن D: تہذیب و تمدن کی تاریخ

باب 7: تہذیب و تمدن

اس باب میں ہم عہد نبوی کی تہذیبی و تمدنی تاریخ کا جائزہ لیں گے۔ ہم ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ عہد نبوی میں کیا سیاسی نظام قائم کیا گیا؟ اس دور کی معیشت کیسی تھی؟ معاشرتی اور ثقافتی سطح پر کیا اقدامات کیے گئے اور اس دور کی اہم معاشرتی تبدیلیاں کیا تھیں۔

سیاسی نظام

مستحکم سیاسی نظام کا قیام

آپ پڑھ چکے ہیں کہ عہد نبوی سے پہلے عرب میں قبائلی نظام سیاست رائج تھا اور اس کی جڑیں عرب معاشرے میں بہت گہری تھیں۔ قیدار کی سلطنت کے زوال کے بعد 1000 برس سے زائد عرصے سے عرب کسی مرکزی حکومت کے تابع نہیں رہے تھے۔ یہ قبائل ایک دوسرے سے دشمنی رکھتے تھے اور ان کے درمیان جنگیں چلتی رہتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے پورے عالم عرب کو ایک حکومت پر اکٹھا کیا۔ اس کے لیے آپ نے مدینہ منورہ میں رہنے والے قبائل کے درمیان ایک سیاسی معاہدہ کیا۔ پھر اس معاہدے میں یہاں کے یہودیوں کو بھی شریک کر لیا۔ اس کے بعد اسی نوعیت کے معاہدات پورے عرب کے قبائل سے کرتے ہوئے ان سب کو ایک نظام کے تحت اکٹھا کر لیا۔ میثاق مدینہ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں یہ امور نمایاں ہیں:

- قبیلے اور خاندان کی بجائے دین کو سیاسی وحدت کی بنیاد بنایا گیا۔ اس سے پہلے عربوں کے ہاں سیاسی وحدت نسل سے قائم ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ مذہب کی بنیاد پر انہیں ایک سیاسی وحدت میں تبدیل کر دیا۔
- قبائل کی سیاسی وحدت برقرار رکھی گئی مگر انہیں مدینہ منورہ کی مرکزی حکومت کے تابع کر دیا گیا۔ ہر قبیلہ اپنے علاقے میں جرائم کی روک تھام کا ذمہ دار تھا۔ اگر ان کے علاقے میں کوئی جرم ہوتا تو اس کے جرمانے کی ادائیگی پورے قبیلے کے ذمے ہوتی۔
- اپنے اندرونی معاملات میں قبائل کو آزادی دے دی گئی لیکن بین القبائل معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاکم تسلیم کر لیا گیا۔
- ظلم کے خلاف سب مل جل کر کاروائی کریں گے۔

- یہودیوں میں سے جو لوگ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے، ان کی ہر طرح سے مدد کی جائے گی، نہ ان پر ظلم ہونے دیا جائے گا اور نہ ہی ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔
- اوس و خزرج کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان کے مسلمانوں کو۔ انہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔
- کسی قاتل کو پناہ نہیں دی جائے گی۔
- حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی جنگی کاروائی نہیں کی جائے گی۔
- کسی بھی اختلاف کی صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رجوع کیا جائے گا۔
- بیرونی حملے کی صورت میں دفاع کی ذمہ داری سب کے لیے مشترک ہو گی۔[1]

اس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا نظام سیاست ترتیب دیا جس میں قبائل کو داخلی خود مختاری دینے کے ساتھ ساتھ ایک مرکزی حکومت کے تحت بھی کر دیا۔ اس سے نہ صرف دشمن قبائل ایک معاہدے میں بندھ گئے بلکہ اس کے نتیجے میں ان کے درمیان انٹریکشن پیدا ہوا جس کے نتیجے میں چند ہی نسلوں کے بعد یہ شیر و شکر ہو گئے۔

حکومتی شعبہ جات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکومت قائم فرمائی، اس میں مختلف شعبے تھے مگر ان کی نوعیت مستقل محکموں کی سی نہیں تھی۔ کام کی نوعیت کے اعتبار سے کسی شخص کو اس کی ذمہ داری دے دی جاتی۔ ہر طرح کے سرکاری عہدے دار کے لیے ''عامل'' کا لفظ استعمال ہوتا جس کا مطلب ہے کارکن یا ورکر۔ گورنر سے لے کر زکوۃ وصول کرنے والے کلیکٹر کو بھی عامل ہی کہا جاتا۔ اس وجہ سے صرف اس ایک لفظ سے کسی شخص کے عہدے اور ذمہ داری کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے: عام طور پر یہ سرکاری فنکشنز ہمیں عہد رسالت میں نظر آتے ہیں:

- **ریاستی سربراہوں کے معاون:** یہ وہ صحابہ ہوتے تھے، جنہیں ان ریاستوں کے سربراہوں کے ساتھ بطور کنسلٹنٹ لگا دیا جاتا، جو اسلام قبول کرتے۔ ان میں مستقل اور قبائلی دونوں طرز کی ریاستیں شامل تھیں۔ سربراہان ریاست ان صحابہ کے مشورے سے اپنے فرائض انجام دیتے۔ اس اہتمام کا فائدہ یہ تھا کہ ان لوگوں میں اعتماد رہتا کہ باہر سے آنے والا کوئی شخص ان پر حکومت نہیں کر رہا ہے بلکہ ان کے اپنے لوگ ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ حضرت علی، معاذ بن جبل اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہم کو یمن میں اسی نوعیت کی ذمہ داریاں دی گئیں۔[2] اسی طرح حضرت عمرو بن عاص کو عمان اور حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہما کو بحرین بھیجا گیا۔
- **زکوۃ اور خراج کے کلیکٹر:** بعض صحابہ کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ مختلف قبائل اور علاقوں سے زکوۃ وصول کریں۔ یہ لوگ

زکوۃ وصول کر کے اس کا زیادہ تر حصہ اسی قبیلے کے غربا میں تقسیم کر دیتے اور کچھ حصہ مرکز میں لے آتے۔ خیبر وغیرہ کی جو زمینیں مزارعت پر دی گئی تھیں، ان سے پیداوار کا نصف وصول کیا جاتا اور اس معاملے میں انتہائی عدل کا مظاہرہ کیا جاتا۔[3]

- **کاتب:** یہ انتہائی اہم عہدہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف سربراہان حکومت کو جو خطوط لکھوایا کرتے تھے، ان کی تحریر اور ترسیل انہی کے ذمہ تھی۔ یہ محض خطوط ٹائپ کرنے والے کلرک نہیں تھے بلکہ حکومت کا ایک ذمہ دار عہدہ تھا۔
- **پولیس:** مدینہ منورہ میں پولیس کا باقاعدہ نظام نہیں تھا البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کو بعض مواقع پر پولیس کی ذمہ داری دی تھی۔[4]
- **عدلیہ:** عربوں میں یہ عام رواج تھا کہ کسی اختلاف کی صورت میں فریقین کسی بھی غیر جانبدار شخص کو ثالث مقرر کر کے اس سے فیصلہ کروالیتے۔ اگر اس کے فیصلے سے ایک فریق کو اطمینان نہ ہوتا تو وہ کسی اور کے پاس چلے جاتے اور اس ثالث کا فیصلہ قانونی طور پر نافذ العمل نہیں ہوا کرتا تھا۔ قبائلی سرداروں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے قانونی طور پر نافذ العمل ہوتے تھے۔ اسی طرح جن لوگوں کو آپ نے گورنروں کا معاون بنا کر بھیجا، ان میں سے بعض حضرات نے عدالتی ذمہ داریاں بھی انجام دیں۔
- **فوج:** عہد رسالت میں باقاعدہ تنخواہ دار فوج نہیں تھی۔ ضرورت پڑنے پر جہاد کا اعلان کیا جاتا تو لوگ اکٹھے ہو جاتے اور ان سے فوج تشکیل دے دی جاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گڈ گورننس اور معاملات کی شفافیت (Transparency) پر زور دیا۔ آپ نے Conflict of Interest کے اصول کے تحت اس بات کی ممانعت کر دی کہ کوئی سرکاری عہدے دار، کسی سے کوئی تحفہ قبول نہ کرے۔ ایک صاحب کو ایسا ہی تحفہ ملا تو آپ نے فرمایا: ''آپ میں سے کوئی اپنے والد یا والدہ کے گھر بیٹھ رہے اور پھر دیکھے کہ اسے ایسا تحفہ ملتا ہے یا نہیں؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! کوئی بھی شخص جو ایسا تحفہ قبول کرے گا، تو وہ روز قیامت اس کی گردن پر سوار ہو گا خواہ وہ اونٹ، گائے یا بھیڑ ہو۔[5]

معیشت

حکومت سنبھالنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معیشت کے فروغ کے لیے غیر معمولی کام کیا۔ آپ نے عرب میں ایسی معاشی اصلاحات جاری فرمائیں، جن کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ یہاں ہم اس کی کچھ تفصیل بیان کر رہے ہیں:

مہاجرین کی آبادکاری اور مؤاخات

سب سے پہلا چیلنج مدینہ میں آنے والے مہاجرین کو سیٹل کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے آپ نے مہاجرین اور انصار میں ایک معاہدہ کروایا جس کے تحت ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی بنادیا۔ انصار ایسے دینی جذبہ سے سرشار تھے کہ انہوں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ ان کی جائیدادوں کا نصف حصہ ان کے مہاجر بھائیوں کو دے دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین نے اسے منظور نہیں کیا بلکہ یہ اہتمام کر دیا کہ مہاجرین انصار کی زمینوں اور باغات میں کام کریں اور پیداوار کو ان کے درمیان ایک طے شدہ فارمولے سے تقسیم کر دیا جائے۔[6] یہ محض معاشی مواخات ہی نہ تھی بلکہ اس کی معاشرتی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگ ہجرت کر کے دوسری جگہ جائیں اور وہاں وہ نمایاں مقام حاصل کر لیں تو کچھ عرصے بعد مقامی آبادی میں ان کے خلاف نفرت جنم لینے لگتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو انصار کا بھائی بنا کر پہلے ہی پیش بندی فرمادی اور یہ ایک دوسرے کے خاندان کا حصہ بن گئے۔

مہاجرین کی معاشی آبادکاری کا انتظام وقتی تھا۔ جیسے جیسے مہاجرین اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے چلے گئے، انہوں نے انصار کی زمینوں کو واپس کر دیا اور اپنے کاروبار خود سنبھالنے لگے۔ بعض صحابہ تو غیر معمولی تاجر بنے۔ ان میں سب سے نمایاں مثال حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ہے۔ ان کے انصاری بھائی نے انہیں اپنی جائیداد کا نصف دینے کی آفر کی لیکن انہوں نے فرمایا: ''اللہ آپ کو مبارک کرے۔ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجیے۔'' اس کے بعد آپ نے چند ہی دن میں اتنا منافع کما لیا کہ مدینہ ہی میں شادی کر لی اور اپنا گھر بسا لیا۔[7] کچھ ہی عرصہ میں آپ کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں ہونے لگا۔

ایسے صحابہ جنہیں مواخات کے اس عمل میں شریک نہ کیا جا سکا تھا، ان کے لئے مسجد نبوی میں صفہ نامی پلیٹ فارم بنا کر عارضی طور پر آباد کیا گیا۔ ان لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھنا مدینہ کی پوری آبادی کے ذمہ تھا۔ ہر شخص کے پاس جو چیز بھی ضرورت سے زائد ہوتی وہ ان لوگوں کو دے دیتا۔ ان صحابہ نے بھی کسی پر بوجھ بننا پسند نہ کیا اور دن میں محنت مزدوری یا تجارت کرنے لگے اور تھوڑے ہی عرصے میں مالی طور پر خود کفیل ہو گئے۔

نظام زکوۃ

دین اسلام میں زکوۃ کا نظام ہمیشہ سے قائم ہے۔ سیدنا موسی علیہ الصلوۃ والسلام کی شریعت میں بھی زکوۃ کا تصور موجود ہے۔ زکوۃ اس کم سے کم رقم کو کہا جاتا ہے جو ہر صاحب ثروت کو غربت کے خاتمے کے لئے ادا کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں دولت کی جو صورتیں موجود تھیں، ان میں آپ نے نے جمع شدہ اموال پر 2.5%، زرعی پیداوار پر 5-10%، معدنی پیداوار اور دفن شدہ خزانوں کی دریافت پر 20% اور جانوروں پر ان کی تعداد، عمر اور نوعیت کے اعتبار سے زکوۃ عائد فرمائی۔ اس زکوۃ کا بنیادی مصرف غربت کا خاتمہ ہی تھا۔ اس زکوۃ کا ایک ضمنی فائدہ یہ ہوا کہ عربوں نے ایک مرکزی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس سے ایک بڑی

تمدنی تبدیلی آئی جس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

صاحب ثروت افراد کو بھرپور ترغیب دلائی گئی کہ وہ زکوۃ تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ رقم حتی کہ اپنی ضرورت سے زائد پورے کے پورے مال کو اپنی خوشی سے اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ یہ محض ایک اپیل ہی نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسا زبردست جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں غربت کے خاتمے کے لئے خرچ کریں۔ اگر حدیث اور تاریخ کے ذخیرے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقے سے خرچ کی جانے والی رقم زکوۃ کی رقم سے کہیں زیادہ تھی۔

جہاں جہاں اسلام پھیلتا چلا گیا، وہاں وہاں یہ نظام زکوۃ رائج کیا گیا۔ کسی شخص کے مسلمان ہونے کی علامت یہ قرار پائی کہ وہ توحید و رسالت کا اقرار کرے، نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔ جو ریاستیں اسلام کے دائرے میں داخل ہوئیں، ان کے حکمرانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا لیکن ان کی مدد کے لیے کچھ صحابہ کو وہاں بھیجا جنہوں نے ان کے امیر لوگوں سے زکوۃ لے کر غریبوں میں تقسیم کر دی۔ اس طریقے سے دولت کی تقسیم کا عمل شروع ہوا اور چند ہاتھوں میں اس کا ارتکاز (Concentration) ختم ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے غرباء و مساکین کے لئے یہ طے کر دیا کہ اگر وہ کوئی قرض چھوڑ کر فوت ہوں گے تو ان کے قرض کی ادائیگی ان کے وارثوں کی نہیں بلکہ حکومت کی ذمہ داری ہو گی۔[8] زکوۃ کے مصارف کو قرآن مجید نے موضوع بنایا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ.

یہ صدقات تو صرف ان لوگوں کے لیے ہیں: غریب؛ مساکین؛ وہ سرکاری کارکن جو اس پر مقرر ہوں؛ وہ لوگ جن کے دلوں میں نرمی پیدا کرنا مقصود ہو؛ غلاموں کی آزادی کے لیے؛ وہ لوگ جن پر جرمانے ہیں (اور وہ ان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے)؛ اللہ کی راہ میں؛ اور مسافروں کے لیے۔ یہ اللہ کی جانب سے فرض ہے اور وہ علم اور حکمت والا ہے۔ (التوبہ 9:60)

دولت کے ارتکاز میں کمی

جس معاشرے میں بھی معیشت آزاد ہو، وہاں یہ مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح چند لوگ تو زندگی کے مزے لوٹتے ہیں جبکہ آبادی کی اکثریت وسائل زندگی سے محروم ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارتکاز دولت کو روکنے کے لیے تین اہتمام فرمائے: ایک تو یہ کہ زکوۃ کی صورت میں امرا سے مال لے کر اسے غربا میں تقسیم کیا جاتا۔ اس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

دوسرا اہتمام سود کی حرمت کی صورت میں سامنے آیا۔ یہی وہ ذریعہ تھا جس کے ذریعے امیر لوگ، غریبوں کو سود پر قرض دے کر انہیں اپنا غلام بنا لیتے اور پھر ان کی تھوڑی بہت جائیداد کو ہتھیا لیتے۔ سود کی حرمت کے بعد ان کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ بغیر محنت

کے، محض سرمایہ قرض پر دے کر ایک طے شدہ آمدنی کما سکیں۔ اگر ان امرا کے پاس وقت نہ ہوتا تو وہ کسی اور کے ساتھ کاروبار کر سکتے تھے جس میں وہ نفع کے ساتھ ساتھ نقصان میں بھی شریک ہوتے۔ اس طرح سے دولت کے ارتکاز کا ایک اہم راستہ بند ہو گیا۔

تیسرا انتظام قرآن کے قانون وراثت کی صورت میں سامنے آیا جس نے چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز کو عملاً ناممکن بنا دیا۔ جیسے ہی ایک شخص فوت ہوتا، اس کا مال اس کی بیوی، بچوں اور والدین (اگر زندہ ہوتے) میں تقسیم ہو جاتا۔ اگر اولاد نہ ہوتی تو بہن بھائیوں کو اولاد کے قائم مقام مان کر دولت انہیں دے دی جاتی۔ بیٹیوں اور بہنوں کو جو حصہ دیا جاتا، وہ ایک خاندان سے نکل کر دوسرے خاندان میں چلا جاتا۔ اس طریقے سے کوئی شخص خواہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہوتا، اگر وہ اور اس کی اولاد کام نہ کرتے تو محض دو نسلوں ہی میں دولت کی تقسیم کے سبب اس کا خاندان مڈل کلاس میں آ جاتا۔ اس کے نتیجے میں معاشرے کے بالائی طبقے میں جو خلا پیدا ہوتا، اس کے نتیجے میں غریب اور مڈل کلاس کے افراد کے لئے مسلسل معاشی اور معاشرتی مواقع پیدا ہوتے رہتے تھے جن کے ذریعے وہ اپنے مالی حالات اور سماجی رتبے کو بہتر بنا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرے میں اپنے مقام کو برقرار رکھنے کے لیے سبھی افراد کو محنت کرنا پڑتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری قوم کو محنت کی عادت پڑ گئی۔

زراعت اور گلہ بانی کا فروغ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے قابل کاشت زمین کی آباد کاری پر بھرپور توجہ دی۔ آپ نے زمین کاشت کرنے اور انسانوں اور جانوروں کے لئے غلہ اگانے کو بہت بڑی نیکی قرار دیا۔[9] ایسی زمینیں جو کسی کی ملکیت نہ تھیں، کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمادیا کہ جو شخص بھی انہیں آباد کرے گا، وہ انہی کی ملکیت ہو جائیں گی۔[10] آپ نے خود ایسی سرکاری زمینیں آباد کرنے کے لئے انصار کے ان لوگوں کو دیں جن کے پاس زمین موجود نہ تھی۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہم اس وقت تک یہ زمینیں نہ لیں گے جب تک آپ ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اسی طرح زمینیں دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ایثار کی تعریف فرمائی۔[11] زمین دینے کے اس عمل کو "اقطاع" کا نام دیا گیا اور یہ اس بات سے مشروط تھا کہ انہیں زرعی مقاصد کے لیے آباد کیا جائے گا اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں یہ زمینیں واپس لے لی جائیں گی۔[12] یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ قانون بنایا کہ جو لوگ تین سال تک زمین آباد نہ کر سکیں، ان سے زمین واپس لے لی جائے۔[13]

جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں کی زمین یہودیوں ہی کے پاس رہنے دی اور اس کی پیداوار کو یہود اور مسلمانوں میں نصف نصف تقسیم کرنے کا اہتمام فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ کرام کے اجماع سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مفتوحہ ممالک کی زمینوں کو سرکاری ملکیت میں رکھا جائے گا اور ان کی آمدنی کو غربت کے خاتمے کے لئے خرچ کیا جائے گا۔[14]

مزارعوں کے ساتھ زیادتی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ مالک زمین کے اس حصے کی پیداوار کو، جو پانی کے قریب ہوتا، اپنے لئے مخصوص کر لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم نے اس استحصالی شرط سے منع فرمادیا۔ اس حدیث کو روایت کرنے والے سیدنا رافع

بن خدیج رضی اللہ عنہ ہیں جو خود زمیندار تھے اور اس طریقے سے زمین کاشت کے لئے دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ اتنے محتاط ہوئے کہ مزارعت سے ہی اجتناب کرنے لگے۔[15]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کی تقسیم سے متعلق قانون سازی فرمائی تاکہ اس سلسلے میں اختلافات پیدا نہ ہوں۔ آپ نے مدینہ کی زمینوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ قاعدہ بنایا کہ جو زمینیں پانی کے چشموں کے اوپر کی جانب ہیں، ان کے مالکان اتنا پانی اپنی زمین پر لگا سکتے ہیں جس میں انسان کے ٹخنے ڈوب جائیں۔ اس سے زائد پانی کو وہ نیچے کی جانب واقع زمینوں کے لیے چھوڑ دیں۔[16] اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ کسی ضرورت مند کو پانی لینے سے منع نہ کیا جائے۔[17]

آپ نے گھوڑوں، اونٹوں اور دیگر مویشیوں کی افزائش نسل کی حوصلہ افزائی کی۔ آپ نے سوائے حکومت کے، اس بات کی ممانعت کر دی کہ کوئی شخص سرکاری زمین پر چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص نہ کرے بلکہ اسے عام لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اس پر اپنے مویشی چرا سکیں۔ بیت المال کے مویشیوں کے لیے البتہ بعض چراگاہیں ضرور مخصوص کی گئیں کیونکہ ان مویشیوں کا فائدہ بھی عام آدمی کو پہنچتا تھا۔[18]

صنعت اور تجارت کی ترقی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محنت کر کے کمانے کی بھرپور ترغیب دی۔ آپ نے فرمایا، "اگر کوئی شخص رسی لے کر لکڑیوں کا گٹھا لائے اور اسے بیچے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔"[19] آپ نے ہاتھ سے کام کرنے کی بہت فضیلت بیان فرمائی اور ہاتھ کی کمائی کو سب سے بہترین کھانا قرار دیا۔[20] اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ محنت و مشقت کی طرف مائل ہوئے۔

عہد نبوی میں ہمیں متعدد قسم کے صنعتوں اور ان کی تجارت کا سراغ ملتا ہے۔ ان میں کپڑے، عطر، سونے چاندی، معدنیات، کھجوریں، چینی، ادویات اور جڑی بوٹیاں، پھل، سبزیاں، کھالیں، چمڑہ اور فرنیچر شامل ہیں۔ جو پیشے نمایاں تھے، ان میں جولاہا، درزی، بڑھئی، سنار، نقاش (نقش و نگار بنانے والے)، مصور، لوہار، رنگ ساز وغیرہ شامل تھے۔[21] ان پیشوں میں سے کسی کو حقیر یا اعلی نہیں سمجھا جاتا تھا اور محنت کرنے والے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

عہد نبوی میں تجارت سے متعلق بھی ایسی اصلاحات کی گئیں جن کے نتیجے میں تجارت فروغ پانے لگی۔ عرب قبائل کے ساتھ جو سیاسی معاہدے کیے گئے، ان کے نتیجے میں امن قائم ہوا اور تجارتی قافلوں کی نقل و حرکت پر پابندیاں ختم ہوئیں۔ اس سے تجارت لوٹ مار کے خطرات سے آزاد ہوئی اور اسے فروغ ملا۔ بین الاقوامی سطح پر مال تجارت جانے لگا اور عربوں نے اپنی اسٹریٹیجک لوکیشن سے فائدہ اٹھا کر اس میں عالمی سطح پر نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ جاہلیت کے تجارتی میلوں کو برقرار رکھا۔[22] اس کی مزید تفصیل ہم عہد صحابہ میں بیان کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی سرگرمیوں پر پابندی عائد فرمائی جو کہ مفاد عامہ اور تجارت کو نقصان پہنچانے والی تھیں۔ آپ نے

کاروبار میں دھوکہ دہی کی سختی سے ممانعت فرمائی۔[23] پورا تولنے کا حکم دیا اور ناپ تول میں کمی کی ممانعت فرمائی۔ ذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا۔ اگر چیز میں عیب ہو، تو اسے خریدار کو بتائے بغیر بیچنے سے منع فرمایا۔ بعض شہری تاجر، شہر سے نکل کر دیہاتیوں سے سستے داموں مال خرید لیتے تھے تاکہ اسے مہنگے داموں فروخت کر سکیں۔ آپ نے اس پر پابندی عائد کی تاکہ دیہاتیوں کو ان کی اشیا کا پورا معاوضہ ملے اور شہریوں کو اشیا کم قیمت پر ملیں۔[24] کاروبار میں ایسی صورتیں، جن میں لڑائی جھگڑا پیدا ہونے کا امکان تھا، ممنوع قرار دی گئیں۔ جوا اور اس نوعیت کی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دیں۔[25]

یہ سب امور وہ تھے، جو چند لوگوں کو تو فائدہ پہنچاتے ہیں مگر ان کی بدولت پورے معاشرے میں تجارتی سرگرمیاں ماند پڑتی ہیں۔ ان پابندیوں پر عمل درآمد کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بازاروں پر سرکاری عہدے دار مقرر فرما رکھے تھے اور آپ خود بھی بازار جا کر ان امور کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ ان اصلاحات کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب میں ایک زبردست معاشی سرگرمی پیدا ہوئی۔ زراعت، گلہ بانی، تجارت، صنعت غرض معیشت کا ہر شعبہ ترقی کرنے لگا۔ اگرچہ یہ اثرات عہد رسالت میں فوری طور پر سامنے نہیں آئی مگر خلافت راشدہ کے دور میں ان اصلاحات کی بدولت مسلم معاشرہ معاشی اعتبار سے دنیا کا خوشحال ترین خطہ بن گیا۔

اخراجات میں اعتدال اور توازن

اسلام نے اخراجات میں اعتدال کی تلقین کی اور بخل اور اسراف دونوں ہی کی مذمت ہمیں قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں ملتی ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا.

(رحمان کے بندے وہ ہیں) جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ تو مال ضائع کرتے ہیں اور نہ ہی بخل سے کام لیتے ہیں اور ان کے درمیان وہ اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ (الفرقان 25:67)

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراف اور بخل دونوں کی مذمت کی اور خوراک، لباس اور مکانات میں اسراف سے منع فرمایا۔ آپ نے صحابہ کرام کو ایسے مکانات بنانے سے منع کیا جن میں پیسے کو پانی کی طرح بہایا گیا ہو۔ اسی وجہ سے آپ نے سونے چاندی کے برتنوں، مردوں کے لیے سونے کے زیورات اور ریشم پہننے کی ممانعت فرمائی۔[26]

معاشرت

معاشرتی اقدار (Values)

کسی بھی معاشرے میں اقدار کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اقدار یا ویلیوز سے مراد وہ امور ہیں جنہیں کسی معاشرے میں اچھا یا برا سمجھا جاتا ہے۔ اچھی چیزوں کو مثبت اقدار (Positive Values) اور بری چیزوں کو منفی اقدار (Negative Values) کہا جاتا ہے۔

مثلاً قدیم عرب معاشرے میں مہمان نوازی ایک مثبت قدر تھی اور وعدہ خلافی منفی قدر سمجھی جاتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور جاہلیت کی ایسی اقدار، جو اسلام کے اخلاقی نظام سے مطابقت رکھتی تھیں، کو لے کر اس میں نہایت ہی قابل قدر اضافے فرمائے ۔ آپ نے اسلامی معاشرے کو جن اقدار پر منظم فرمایا، ان کی تفصیل یہ ہے۔

اسلامی معاشرے کی سب سے بنیادی قدر **"مساوات"** تھی۔ دور جاہلیت میں عرب قبائلی نخوت میں مبتلا تھے۔ یہ اپنے سوا دیگر اقوام اور دیگر عرب قبائل کو حقیر سمجھتے تھے۔ قبیلے کے حلیفوں اور موالی (آزاد کردہ غلاموں) کو بھی اس کے اصل ممبران کی نسبت حقیر سمجھا جاتا اور غلاموں کی تو کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ اسلام نے مساوات کو یہ حیثیت دی کہ حضرت بلال حبشی اور صہیب رومی رضی اللہ عنہما جیسے سابقہ غلاموں کو اس معاشرے میں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہوا۔ اس مساوات کا سب سے بڑا مظہر نماز تھی جس میں ہر شخص، ایک ہی صف میں کھڑا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس مساوات کو موضوع بنا کر فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ.

اے لوگو! ہم نے آپ لوگوں کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر آپ کو قومیں اور قبیلے اس لیے بنا دیا کہ آپ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر سکیں۔ یقیناً اللہ کے نزدیک آپ میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ یقیناً اللہ علیم و خبیر ہے۔ (الحجرات 49:13)

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

اے لوگو! آپ کا رب ایک ہے اور آپ کے والد ایک ہیں۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری حاصل نہیں اور نہ ہی کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی برتری حاصل ہے۔ نہ تو کسی سرخ رو (سفید فام) کو کسی سیاہ فام پر برتری حاصل ہے اور نہ ہی کسی سیاہ فام کو سفید فام پر۔ برتری کا معیار صرف تقوی ہے۔[27]

اس مساوات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی معاشرے میں ہر شخص اپنائیت محسوس کرنے لگا اور اس نے اپنی پوری توانائیاں اس معاشرے کو ترقی دینے میں لگا دیں۔

مساوات ہی سے متعلق **"عدل اور میرٹ"** کی قدر اسلامی معاشرے میں پھیلنے لگی۔ ہر کام میرٹ پر ہونے لگا۔ کوئی بھی سرکاری عہدہ محض اس وجہ سے کسی کو نہ دیا جاتا کہ وہ کسی خاص خاندان یا قبیلے سے تعلق رکھتا ہے بلکہ متعلقہ شخص کی اہلیت دیکھ کر ہی اسے وہ عہدہ دیا جاتا۔ اپنے آخری ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو ایک ایسی مہم کا سربراہ بنایا جس میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے اکابر موجود تھے۔[28] حضرت اسامہ اس وقت بیس سال کے نوجوان تھے اور ایک آزاد کردہ غلام کے بیٹے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اگر ایک چھوٹے سر والا حبشی غلام بھی حکمران بنایا جائے تو اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔[29] ایک اور آزاد کردہ غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہ نماز کی امامت کروایا کرتے تھے کیونکہ وہ قرآن کے بڑے عالم

تھے۔ ان کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے زمانے میں زندہ ہوتے تو میں انہیں اگلا خلیفہ بنانے کی وصیت کر دیتا۔

اسلامی معاشرے کی بنیاد **"اخوت"** کے جذبے پر قائم ہوئی۔ مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھنے لگے۔ اسلام نے صلہ رحمی کو ایک بڑی قدر قرار دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے حقوق ادا کیے جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اپنے حقوق کی بجائے اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق کے لیے حساس بنا دیا۔ ہر شخص کو یہ فکر رہنے لگی کہ وہ دوسروں کے حقوق ادا کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاقات کے وقت سلامتی کی دعا دینے یعنی سلام کرنے کی سنت جاری فرمائی۔ قرآن و حدیث میں پڑوسیوں، مساکین، یتیموں، مسافروں اور مہمانوں کے ساتھ خصوصی طور پر اچھے سلوک کی تلقین کی گئی اور آپس میں تجسس، بدگمانی، غیبت، تکبر اور اس جیسے امور سے منع فرمایا گیا۔ اس طرح سے مدینہ کے اسلامی معاشرے میں پورے عرب کے لوگوں کے لیے انتہائی کشش پیدا ہو گئی۔ اسلام کے معاشرتی نظام کی تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے اور مدنی معاشرے کو انہی پر منظم کیا گیا:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ. يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ. يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ.

اگر اہل ایمان کے دو گروہوں میں لڑائی ہو جائے تو ان میں صلح کروا دیا کریں۔ اگر ان میں ایک دوسرے کے خلاف زیادتی کرے تو اس سے اس وقت تک جنگ کیجیے جب تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ نہ آئے۔ اگر وہ لوٹ آئے تو پھر ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کروا دیا کیجیے۔ انصاف کیجیے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اہل ایمان تو محض بھائی بھائی ہیں، اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کروا دیا کریں اور اللہ کے معاملے میں محتاط رہیے تاکہ آپ پر رحم کیا جائے۔

اے اہل ایمان! کوئی گروہ، کسی اور گروہ کا مذاق نہ اڑائے۔ ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہی خواتین دیگر خواتین کا مذاق اڑائیں کہ ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ ایک دوسرے کے خلاف طعنہ جوئی نہ کیجیے اور نہ ہی ایک دوسرے کے برے نام رکھیے۔ ایمان کے بعد برے نام رکھنا ایک برا عمل ہے۔ جس نے (اس سے) توبہ نہ کی تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

اے اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے بچیے کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کیجیے اور نہ ہی آپ میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا آپ میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یقیناً آپ اسے ناپسند کریں گے۔ اللہ سے ڈرتے رہیے، یقیناً

اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اے انسانو! ہم نے آپ کو ایک مرد اور ایک خاتون سے پیدا کیا، پھر آپ کو قومیں اور قبیلے محض اس لیے بنایا کہ آپ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر سکیں۔ یقیناً اللہ کے نزدیک آپ میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ یقیناً اللہ علیم و خبیر ہے۔ (الحجرات 49:6-13)

"ایفائے عہد" کو بھی مدنی معاشرے میں غیر معمولی قدر کی حیثیت حاصل ہوئی۔ دور جاہلیت ہی سے عرب وعدوں اور معاہدوں کی پابندی کو لازمی سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس درجے میں سختی کی کہ مسلمانوں کو دیگر مسلمانوں کی مدد کے لیے کسی ایسے دشمن کے خلاف بھی فوجی کاروائی سے منع کر دیا جس کے ساتھ ان کا کوئی معاہدہ ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ.

یقیناً جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا، اور جن لوگوں نے ان (مہاجرین) کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دار الاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا مدد کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ (یاد رکھیے کہ) جو کچھ آپ کر رہے ہیں، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ (الانفال 8:72)

قبائلی دشمنیوں کا خاتمہ اور ان میں قربت (Integration)

عہد رسالت میں اس عمل کا آغاز کیا گیا کہ عرب معاشرہ، جو مختلف قبائل میں منقسم ہے، کو ایک مربوط اور متحد معاشرے کی شکل دی جائے۔ یہ عمل ہمیشہ سست ہوتا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ یکدم اپنے قبیلے سے وفاداری کو چھوڑ کر دین کی سطح پر اکٹھے ہو جائیں۔ چنانچہ اس پراسیس کا آغاز عہد رسالت میں ہوا اور اس کی تکمیل میں کئی سو برس لگے۔ عہد رسالت میں ان قبائل کی باہمی دشمنی کو ختم کر کر کے ان میں محبت پیدا کی گئی اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر بتا دیا کہ جاہلیت کے زمانے کے انتقام کا سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر قبائل کے مابین مزید کوئی جھگڑا ہو تو اس کا فیصلہ مدینہ کی مرکزی حکومت کرے گی۔ قبائلی عصبیت کی جگہ دینی عصبیت کو اہمیت دی گئی اور یہ دین اسلام ہی تھا جس کی بدولت دشمن قبائل آپس میں دوست بن گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ

شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ.

آپس میں مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیجیے اور تفرقہ میں مبتلا نہ ہو جایئے۔ اللہ کی خود پر ہونے والی اس نعمت کو یاد کیجیے جب آپ لوگ دشمن تھے تو اس نے آپ کے دلوں میں محبت پیدا فرمادی تو اس کی نعمت کے سبب آپ لوگ بھائی بھائی بن گئے۔ اور آپ لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے آپ کو اس سے بچا لیا۔ اللہ اسی طرح اپنی آیات کو بیان کرتا ہے تاکہ آپ لوگ ہدایت پائیں۔ (آل عمران 3:103)

دشمنیاں ختم ہونے سے جب شاہراہوں پر امن ہوا تو مختلف قبائل کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے جس سے قربتیں بڑھیں۔ مختلف قبائل میں رشتے داریاں ہونے لگیں۔ خلافت راشدہ کے دور میں بہت سے قبائل اپنے علاقے چھوڑ کر عراق اور شام میں جا بسے جس سے ان میں مزید قربتیں پیدا ہوئیں اور قبائلی عصبیتوں کا خاتمہ ہوا۔ دو تین صدیوں کے عرصے میں یہ پراسیس مکمل ہوا اور قبائلی عصبیتوں کی جگہ دینی عصبیت نے لے لی۔ عصبیت، علم عمرانیات کی ایک اصلاح ہے۔ یہ اس بانڈ کو کہتے ہیں جس کے ذریعے انسان خود کو کسی اجتماعیت سے وابستہ سمجھتا تھا۔ یہ بانڈ نسل، رنگ، مذہب، علاقہ، زبان کسی بھی بنیاد پر بن سکتا ہے۔

دور جاہلیت کے عربوں میں عصبیت کی بنیاد قبیلہ تھی۔ ان کے اندر قبیلے سے جو وابستگی پائی جاتی تھی اور اس کے لیے کٹ مرنے کا جو جذبہ ان کے اندر موجود تھا، اسلام نے اسی وابستگی اور کٹ مرنے کے جذبے کا رخ قبیلے کی بجائے دین کی طرف موڑ دیا۔ وہی عرب، جو اپنے قبیلے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار رہتے تھے، اب اسی جذبے کے ساتھ دین کی خاطر جان قربان کرنے کے جذبے سے معمور ہو گئے۔ ان کی عقیدتوں کا مرکز بدل کر اب اللہ تعالی کی ذات ہو چکی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی وفاداری کا مرکز قبیلے کی بجائے دین اور مرکزی حکومت بن گئی۔ اس طرح سے ان کے معاشرے کا پورا ڈھانچہ ہی تبدیل ہو گیا۔ یہ ایک عظیم تبدیلی (Paradigm Shift) تھی، جس کی مثال کم ہی تاریخ انسانی میں ملتی ہے۔

مرد اور خواتین کے حقوق میں توازن

دور جاہلیت میں خواتین کو بہت سے حقوق حاصل نہیں تھے، اسلام نے انہیں یہ حقوق ادا کیے۔ خواتین کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا تھا مگر اسلام نے اس کا اہتمام کیا کہ انہیں وراثت میں حصہ دیا جائے۔[30] دور جاہلیت میں مرد اپنی بیوی کو جتنی چاہے طلاقیں دیتا اور پھر رجوع کرتا۔ اس کا خاتمہ کرنے کے لیے تین طلاق کی حد مقرر کی گئی تاکہ کوئی اپنی بیوی کو تنگ نہ کر سکے۔ طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں خواتین کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ بعض مرد اپنی خواتین سے ازدواجی تعلق قائم نہ کرنے کی قسم کھا لیتے، اس کے لیے چار ماہ کی مدت مقرر کی گئی جس کے بعد طلاق کے خود بخود واقع ہو جانے کا قانون بنایا گیا۔[31] عربوں میں تعدد ازدواج کا رواج تھا کیونکہ ان کے ہاں جنگوں میں مرد مرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے خواتین کی آبادی مردوں سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ ایک شخص لاتعداد شادیاں کر سکتا تھا۔ عہد رسالت میں اس کے لیے زیادہ سے زیادہ چار شادیوں کی حد مقرر کی گئی اور اسے بھی عدل و انصاف کے ساتھ مشروط کر دیا

گیا۔[32]

خواتین کو کاروبار کرنے کی آزادی دور جاہلیت ہی میں حاصل تھی، اسے اسلام میں بھی برقرار رکھا گیا۔[33] دور جاہلیت میں جنگوں کے دوران خواتین کو لونڈیاں بنالیا جاتا تھا، اسلام میں اس کا سدباب اس طرح کیا گیا کہ بین القبائلی جنگوں کو ختم کر دیا گیا۔ اس طرح سے مسلم خواتین محفوظ ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان خواتین نے اسلام کے فروغ میں اپنا کردار ادا کیا۔ انہوں نے نئی نسلوں کی اسلامی تربیت کی ذمہ داری کو بخیر و خوبی نبھایا۔ اگرچہ خواتین کے کارنامے بہت زیادہ نمایاں نہ ہو سکے لیکن یہ بات طے ہے کہ اگر مسلم خواتین بھی اس جذبے سے اپنی خدمات انجام نہ دیتیں تو مسلمان دنیا میں کبھی اتنا بڑا انقلاب نہیں لا سکتے تھے۔

غلامی کا خاتمہ

دور جاہلیت میں سب سے پسا ہوا طبقہ غلاموں کا تھا جن کے ذمے صرف فرائض ہی فرائض تھے مگر حقوق نہیں تھے۔ ان کی آزادی کے لیے اسلام نے جو اقدامات کیے، ان کی تفصیل آپ ہماری کتاب ''اسلام میں ذہنی و جسمانی غلامی کے انسداد کی تاریخ'' میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ہم ان کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں:

- غلاموں کی آزادی کو مکی زندگی کی ابتدا ہی سے ایک بڑی نیکی قرار دیا گیا۔
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود غلاموں کی آزادی کی فضیلت بیان فرمائی اور صحابہ کرام کو اس کی ترغیب دی۔[34] آپ اس میں خصوصی دلچسپی لیا کرتے تھے اور خود اپنی ذاتی دولت کا بڑا حصہ غلاموں کی آزادی میں صرف کیا کرتے تھے۔ اپنی وفات کے وقت آپ اپنے تمام غلاموں کو آزاد کر چکے تھے۔
- جو غلام خود آزاد ہونا چاہتے، ان کے لیے مکاتبت کا قانون بنا دیا گیا جس کے تحت وہ اپنی آزادی خرید سکتے تھے۔ اس کے لیے انہیں حکومت کی جانب سے مالی مدد بھی مل جاتی تھی۔ خود ان غلاموں کو آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی۔ صحابہ کرام بڑھ چڑھ کر ان مکاتبت کرنے والے غلاموں کی مدد کرتے تھے۔
- زکوۃ اور دیگر پبلک فنڈز کا ایک حصہ غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کے لیے مختص کر دیا گیا۔
- قسم، ظہار اور روزہ توڑنے کے کفارے اور دیت کی ادائیگی کے لیے غلاموں کی آزادی کو ایک آپشن کے طور پر رکھا گیا۔

اس کے باوجود جو لوگ ابھی غلامی میں مبتلا تھے، ان کی عزت نفس کو بحال کرنے کے لیے اس بات کی ممانعت کی گئی کہ انہیں غلام یا لونڈی کہا جائے بلکہ انہیں بیٹا یا بیٹی کہنے کا حکم دیا گیا۔ ان سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا اور ان پر کام کا بوجھ لادنے کی ممانعت کی گئی۔ انہیں بنیادی ضروریات کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین خود جائزہ لیا کرتے تھے۔ غلاموں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانے کی تلقین کی گئی۔ ان پر ہر قسم کے تشدد کی ممانعت کر دی گئی۔ ان کی شادیوں کی ترغیب دی

گئی اور ان کی اس طریقے سے خرید و فروخت کی ممانعت کی گئی جس سے غلاموں کے خاندان الگ ہو جائیں۔ جنگوں میں ملنے والے مال غنیمت میں ان غلاموں کو حصہ دیا جانے لگا۔

لونڈیوں کے لیے یہ خصوصی اصلاح کی گئی کہ انہیں اپنے مالک کی تقریباً بیوی ہی قرار دیا گیا اور انہیں کم و بیش وہی حقوق دیے گئے جو ایک آزاد بیوی کو حاصل ہوتے ہیں۔ ایک بچہ جننے کے بعد ایسی لونڈی کی خرید و فروخت ممنوع قرار دی گئی۔ دور جاہلیت میں مالکان ان لونڈیوں سے قحبہ گری کروایا کرتے تھے۔ اس کی سختی سے ممانعت کی گئی۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو اپنے والدین اور رشتے داروں کی وراثت میں حصہ دیا جانے لگا۔ جرائم کی صورت میں غلاموں اور لونڈیوں کی سزا آزاد مرد و زن کا نصف مقرر کی گئی۔ ان تمام حقوق کو یقینی بنانے کے لیے غلاموں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ جب چاہیں حکومت کے پاس آ کر فریاد کر سکتے ہیں اور ایسی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان غلاموں کو آزاد کر دیا کرتے تھے یا ان کے حقوق کا تحفظ یقینی بناتے تھے۔

آزاد کردہ غلاموں کا سماجی مرتبہ بلند کرنے کے لیے اسلام نے دور جاہلیت کے قانون ولاء کا سہارا لیا۔ اس کی رو سے آزاد کردہ غلاموں کو ان کے سابق آقاؤں کے خاندان کا حصہ قرار دیا گیا اور ان کی شادیوں اور روزگار کا اہتمام کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تحریک پیدا فرمائی جس کے تحت بہت سے عربوں میں جاہلی نخوت کا ایسا خاتمہ ہوا کہ وہ ان آزاد کردہ غلاموں سے اپنی بیٹیوں کا رشتہ کرنے لگے۔ ان غلاموں کو وہی اسٹیٹس دیا گیا جو ان کے سابق آقاؤں کا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلاموں جن میں حضرت زید بن حارثہ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہما شامل تھے، کو اپنے اہل بیت کا حصہ قرار دیا۔

یہ معاملات تو پہلے سے موجود غلاموں کے تھے۔ آئندہ کے لیے غلام بنانے کے تمام راستے بند کر دیے گئے اور سوائے جنگی قیدیوں کے، کسی اور کو غلام بنانے کی ممانعت کی گئی۔ ان جنگی قیدیوں کو بھی عارضی طور پر غلام بنایا جاتا اور یہ ان کے لیے قید کی سزا ہوتی۔ کچھ ہی عرصے میں جب یہ اسلامی ماحول میں رچ بس جاتے اور تو انہیں آزاد کر دیا جاتا۔[35] کسی آزاد شخص کو اغوا کر کے غلام بنانے کو نہ صرف ایک جرم بلکہ ایک بڑا مذہبی گناہ بھی قرار دیا گیا جس کا نتیجہ ایسے شخص کو دنیا و آخرت دونوں میں بھگتنا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کو ایک حکم کے ذریعے آزاد کیوں نہ کر دیا گیا؟ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ غلاموں کی بہت بڑی آبادی موجود تھی جن میں بوڑھے اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ خود ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ آزادانہ زندگی بسر کر دیتے اور انہیں آزاد کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ بے روزگاروں کا بہت بڑا طبقہ وجود میں آ جاتا۔ اس وجہ سے اسلام نے انہیں تدریجاً آزادی عطا کی تاکہ یہ غلام آسانی سے آزادی کے بعد سیٹل ہو سکیں۔

معاشرتی طبقات

دنیا کے دیگر معاشروں کی طرح مدینہ میں بھی مختلف طبقات موجود تھے اور امیر، غریب اور متوسط طبقے ان کے ہاں بھی تھے لیکن اور معاشروں کے برعکس ان امیر اور غریب لوگوں میں باہمی نفرت نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے شروع ہی سے اس

بات پر زور دیا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالی نے مالی وسعت عطا کی ہے، ان پر فرض کے درجے میں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے ان بھائیوں کی خبر گیری کریں جو معاش کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ جن صحابہ مثلاً حضرت ابو بکر، عثمان، عبد الرحمن بن عوف، سعد بن عبادہ، ابو طلحہ رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالی نے مال و دولت سے نوازا تھا، وہ اس کا بڑا حصہ غربا و مساکین کی خبر گیری پر خرچ کرتے تھے۔ اس وجہ سے مدینہ کے معاشرے میں طبقاتی تفریق نمایاں نہیں ہوئی اور امیر و غریب میں فرق زیادہ نہیں بڑھ سکا۔

شہری امور اور ٹاؤن پلاننگ

ہجرت نبوی سے لے کر فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کو ہر اس شخص پر لازم قرار دیا جس نے اسلام قبول کیا ہو اور اسے اپنے معاشرے کے ظلم و تشدد کا سامنا ہو۔ اس وجہ سے آٹھ سال کے اس عرصے میں اہل مکہ میں سے بہت سے لوگ ہجرت کر کے مدینہ آتے رہے۔ ان حضرات کی مدینہ میں کسی سے مواخاۃ کروادی جاتی۔ جیسے جیسے یہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے تو اپنا گھر الگ بسا لیتے۔ اس وجہ سے مدینہ منورہ کی آبادی بڑھنے لگی اور نئے مکانات کی تعمیر ہونے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ پلاننگ سے شہر میں توسیع فرمائی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہد نبوی میں عرب میں دیہات سے شہروں کی طرف آبادی کی منتقلی (Urbanization) کا عمل شروع ہوا اور یہ پراسیس خلافت راشدہ کے دور میں اپنے عروج کو پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت مدینہ منورہ میں تقریباً 800 گھر تھے اور بعض اہل علم کا اندازہ ہے کہ آپ کی وفات کے وقت ان کی تعداد بڑھ کر 2000-2500 ہو چکی تھی۔[36]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کو مدینہ منورہ کی دینی اور دنیاوی زندگی کا مرکز (Nucleas) بنا دیا۔ آپ نے مدینہ تشریف آوری کے بعد ابتدائی مہینوں ہی میں مسجد کی تعمیر فرمائی۔ یہ صرف عبادت گاہ نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز تھی۔ اس مسجد کو پارلیمنٹ ہاؤس، سیکرٹریٹ، عدالت، اسکول یا کالج، مال زکوۃ اور غنیمت کی تقسیم کا مرکز، کمیونٹی سنٹر، طلبا کا ہاسٹل، وفود کی قیام گاہ اور اس نوعیت کی بہت سی حیثیتیں حاصل تھیں۔ مسجد کی تعمیر بہت ہی سادہ تھی۔ دیواریں کچی تھیں، مسجد کھجور کے درختوں کے ستونوں پر کھڑی تھی اور اس پر کھجور کے پتوں کی چھت ڈلی ہوئی تھی۔ چونکہ مسلمانوں کی زندگی کا مرکز مسجد نبوی تھا، اس لیے اس مسجد کے قرب و جوار میں گھر بنائے گئے اور صحابہ کی کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ وہ مسجد نبوی کے قریب ترین گھر حاصل کریں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل خانہ کے لیے جو چھوٹے چھوٹے کمرے تعمیر کیے، وہ مسجد نبوی سے متصل تھے۔

مدینہ منورہ کے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے جنگ خندق کے موقع پر خندق کھودی گئی جس سے اس شہر کا دفاع ناقابل تسخیر ہو گیا۔ عہد نبوی کا مدینہ کم و بیش اتنا ہی تھا جتنا کہ اب ہے مگر اس وقت یہاں کی آبادی مختلف مقامات پر بکھری ہوئی تھی۔ ایک خاندان ایک جگہ آباد ہوتا اور اس سے کچھ فاصلے پر دوسرا خاندان آباد ہوتا۔ ان کے درمیان کی زمین یا تو خالی پڑی ہوتی یا پھر اس پر کھیت اور باغات ہوتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اہتمام فرمایا کہ ایسے ہر محلے میں ایک مسجد تعمیر کی جائے جو اس محلے کا مرکز بن جائے اور یہ

مسجد نبوی پورے شہر کا مرکز ہو۔ ایسے قطعات جو زراعت کے لیے مناسب نہ تھے، میں گھر تعمیر کیے جانے لگے۔ یہ گھر ایسے ہوتے کہ بارش سے بچاتے اور ان میں ہوا اور دھوپ کا اہتمام ہوتا۔[37] جب یہودی قبائل کو مدینہ سے نکالا گیا تو باہر سے آنے والے لوگوں کو ان کے گھروں میں پناہ دی گئی۔

شہر مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں زیادہ سے زیادہ باغات اور درخت لگانے کی کوشش کی گئی تاکہ شہریوں کو صاف ہوا ملے اور معیشت بھی بہتر ہو۔ زمینوں کی آبادکاری کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک مسئلہ پانی کا تھا۔ یہاں میٹھے پانی کا ایک کنواں تھا جو بئر رومہ کہلاتا تھا۔ یہ ایک یہودی کی ملکیت تھا جو اس کا پانی دینے میں پس و پیش کرتا تھا اور اس کی قیمت وصول کرتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے خرید کر تمام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ اس طرح سے شہر میں پانی کا مسئلہ حل ہو گیا۔[38]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں ایسے احکام بھی ملتے ہیں جن کا تعلق شہری امور (Civic Affairs) سے ہے۔ چنانچہ احادیث مبارکہ میں سڑکوں کو کشادہ رکھنے کی ہدایت کی گئی اور اس کی کم سے کم حد سات ہاتھ یعنی 3.5 میٹر مقرر کی گئی۔[39] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سڑک کو تنگ یا بند کرنے کو ایک بہت بڑا گناہ قرار دیا[40] اور راستے سے کوئی بھی تکلیف دہ چیز ہٹانے کو ایک بڑی نیکی قرار دیا۔[41] قرآن مجید میں اس بات کو موضوع بنایا گیا کہ کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہوا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص اپنے گھر کی دیواروں کو اتنا بلند نہ کرے جس سے پڑوسیوں کے گھروں میں ہوا رک جائے۔ کسی کے گھر میں جھانکنے کو آپ نے قابل سزا جرم قرار دیا۔[42] احادیث میں اس بات کی ہدایت بھی ملتی ہے کہ رات کو سونے سے پہلے چراغ گل کر دیا جائے تاکہ آگ لگنے کا خطرہ نہ رہے۔ آپ نے رات کو سونے سے پہلے دروازوں کو بند کرنے اور پانی کے برتنوں کا منہ بند کرنے کا حکم دیا۔[43]

اسلام میں چونکہ طہارت اور پاکیزگی کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، اس وجہ سے مسلمان یہ اہتمام کرنے لگے کہ ان کے جسم، لباس، جگہ اور شہر ہر طرح کی آلودگی سے پاک صاف ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ سڑکوں یا سایے کی جگہ یا پانی کے ذخیرے کے پاس بول و براز (یعنی پیشاب وغیرہ ہرگز نہیں) ڈالا جائے اور انہیں آلودہ کیا جائے۔[44]

ثقافت (Culture)

مدینہ منورہ جہاں عرب کی سیاست اور معیشت کا مرکز بنا، وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بھی بنا دیا لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ثقافتی امور کو دین کے تابع رکھا جائے اور ان سے مفید کام لیے جائیں۔

تہوار

دور جاہلیت میں مدینہ میں دو تہوار رائج تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جگہ عید الفطر اور عید الاضحی کے دور تہواروں کو بطور سنت جاری فرمایا۔ ان دونوں تہواروں کا آغاز نماز سے کرنے کی سنت قائم کی تاکہ لوگ دنیاوی سرگرمیوں میں پڑ کر اللہ تعالی کو بھول نہ جائیں۔ عید الفطر سے پہلے رمضان کے پورے مہینے کو عبادت کا مہینہ قرار دیا۔ اسی طرح عید الاضحی کے موقع پر قربانی کی سنت قائم فرمائی۔ ان مواقع پر روزہ رکھنے کو ممنوع کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کھانے پینے اور خوشی منانے کے دن قرار دیا۔

تجارتی اور ثقافتی میلے

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ دور جاہلیت میں متعدد تجارتی میلے رائج تھے جہاں تجارت کے ساتھ ساتھ ثقافتی سرگرمیاں بھی جاری رہا کرتی تھیں۔ ان میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلے زیادہ مشہور تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں برقرار رکھا۔ زمانہ اسلام میں بعض صحابہ کو یہ خیال آیا کہ دور جاہلیت کی اس رسم کو ختم ہو جانا چاہیے لیکن اللہ تعالی نے قرآن مجید میں اس بات کی اجازت دے دی کہ سفر حج میں تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔[45] ان میلوں میں ثقافتی سرگرمیاں جیسے خطابت، شاعری اور اس نوعیت کے امور جاری رہے۔

کھیل اور تفریح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایسے کھیلوں کی سرپرستی فرمائی جو مثبت پہلو رکھتے ہوں۔ ایسے کھیل، جن میں جوا یا محض وقت کا ضیاع ہو، سے آپ نے منع فرمایا۔ چنانچہ تیر اندازی، شمشیر زنی، نیزہ بازی، گھڑ سواری، گھڑ دوڑ، تیراکی اور اس نوعیت کے دیگر جسمانی کھیلوں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور نرد شیر، چوسر اور جوئے کی دیگر اقسام کی ممانعت کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑوں کی باقاعدہ ریس کروایا کرتے تھے۔[46] اس کا مقصد مثبت سرگرمیوں کو فروغ دینا ہوا کرتا تھا۔ ایک موقع پر کچھ سوڈانیوں نے عید کے دن نیزوں اور ڈھالوں کی مدد سے ایک کھیل پیش کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خود یہ کھیل دیکھا۔[47] عہد رسالت میں بچے مختلف کھیل کھیلا کرتے تھے اور انہیں اس سے کبھی نہیں روکا گیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ شفقت فرماتے تھے۔[48]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باغات اور کھلی جگہوں پر وقت گزارنے کو پسند فرماتے تھے۔ احادیث میں حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے باغ، جس کا نام "بیر حاء" تھا، کا ذکر ملتا ہے جس میں حضور اکثر تشریف لے جایا کرتے تھے، یہاں آپ سائے میں بیٹھتے اور اس کے کنویں کا پانی شوق سے پیتے تھے۔[49] آپ نے ایک مرتبہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوڑ لگائی اور اس میں سیدہ آگے نکل گئیں۔ کچھ عرصہ بعد پھر ایسا ہی کیا اور اس مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے اور فرمایا: "یہ اس کا بدلہ تھا۔"[50]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچھے مزاح کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ ایک بدری صحابی حضرت نعیمان بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ بہت ہنسنے ہنسانے والے تھے اور نبی کریم ان کے مزاح پر تبسم فرمایا کرتے تھے۔[51] آپ خود بھی اپنے اہل بیت اور صحابہ سے مزاح فرمایا کرتے تھے جو کہ اعلی درجے کی اخلاقی حدود کے دائرے میں ہوا کرتا تھا۔

فنون لطیفہ (Fine Arts)

فنون لطیفہ جیسے مصوری، موسیقی، شاعری، خطابت وغیرہ کا تعلق انسان کے لطیف جذبات واحساسات سے ہے۔ ان فنون کی حیثیت دو دھاری تلوار کی سی ہے۔ ان کی مدد سے لوگوں کو نیکی کی جانب راغب کر کے ان سے مثبت کام بھی لیا جا سکتا ہے اور برائیوں کو فروغ بھی دیا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدنی معاشرے میں مثبت اور بامقصد سرگرمیوں کو فروغ دینا چاہتے تھے اور بے مقصد اور منفی سرگرمیوں سے اپنے صحابہ کو روکنا چاہتے تھے، چنانچہ آپ نے مدنی معاشرے میں آرٹ کی سرپرستی فرمائی تاہم اس کے غلط استعمال سے منع فرمایا۔ آپ پڑھ چکے ہیں عربوں میں شاعری اور خطابت کا دور جاہلیت سے زبردست رواج چلا آرہا تھا اور قرآن مجید اسی کا معجزہ تھا۔ مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعری اور خطابت کے فن کی سرپرستی فرمائی لیکن ان فنون کا استعمال مثبت امور میں ہونے لگا۔ حضرت حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ اور خنسار ضی اللہ عنہم عرب کے بڑے شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب، اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وستائش اور جذبہ جہاد کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح خطابت کا بھی مثبت استعمال کیا گیا اور اسے امت کی اخلاقی تربیت کے لیے استعمال کیا۔ اس کی سب سے اعلی مثال خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات میں ملتی ہے۔

جہاں تک مصوری اور مجسمہ سازی کا تعلق ہے تو اس کا غالب استعمال اس زمانے میں شرک کے مظاہر کے لیے کیا جاتا تھا۔ مختلف دیوی دیوتاؤں کی تصاویر اور مجسمے بنائے جاتے جنہیں پوجا کے لیے استعمال کیا جاتا۔ تاہم ہندوستان اور روم ویونان کی نسبت یہ فن عرب میں بالکل ابتدائی درجے کا تھا۔ اس شرکیہ استعمال کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فن کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی تاہم مختلف احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی تصاویر کی اجازت دی گئی جن میں درختوں اور قدرتی مناظر کو دکھایا گیا ہو اور جن کے ساتھ کوئی شرکیہ تصور موجود نہ ہو۔[52]

یہی معاملہ موسیقی کا تھا۔ عرب میں موسیقی کی ایسی محفلوں کا رواج تھا جن میں شراب پی جاتی، گلوکارائیں ریشمی لباس پہن کر رقص کا مظاہرہ کرتیں۔ اس سے ناظرین کے جنسی جذبات بھڑکتے اور نوبت بدکاری تک پہنچ جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی محفلوں کی ممانعت فرما دی۔ آپ نے ایسی محفلوں کے بارے میں شدید وعید ارشاد فرمائی۔[53] عرب میں جہاں جہاں بھی پیشہ ور طوائفیں موجود تھیں، ان کے ٹھکانوں کو ختم کیا گیا۔ اس بات کی سختی سے ممانعت کر دی گئی کہ کوئی شخص اپنی لونڈیوں کو طوائف بننے

پر مجبور نہ کرے اور جن لونڈیوں نے یہ شکایت کی کہ انہیں ان کے مالک بدکاری پر مجبور کرتے ہیں، انہیں آزاد کر دیا گیا۔[54] گانے بجانے والی لونڈیوں کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کی گئی اور ان کی کمائی کھانے کو حرام قرار دیا گیا۔[55]

ان پابندیوں کے ساتھ ایسے نغموں کی، جو بے حیائی سے پاک ہوں، اجازت دی گئی۔ اس بات پر اہل علم کا اختلاف ہے کہ یہ گانے، بغیر سازوں کے ہوا کرتے تھے یا نہیں تاہم اس بات پر تمام علما متفق ہیں کہ کم از کم بغیر ساز کے موسیقی کی اجازت تھی۔ سازوں میں بھی دف کی اجازت دے دی گئی جس کا عرب میں عام رواج تھا۔ عربوں میں حدی خوانی کا رواج تھا جو عہد اسلام میں بھی جاری رہا۔ یہ ایسا گانا تھا جسے سن کر اونٹ مست ہو جاتے تھے اور ان کی رفتار تیز ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر بچیاں دف بجا کر گا رہی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روکا نہیں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ٹوکنے پر انہیں منع کرتے ہوئے فرمایا: ”یہ ہماری عید کا دن ہے۔“[56] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک خاتون کی شادی انصار مدینہ میں کروائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عائشہ! آپ لوگوں کے ساتھ کوئی کھیل تماشا کیوں نہیں ہے کیونکہ انصار کھیل تماشوں کو پسند کرتے ہیں۔“[57]

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں ثقافتی سرگرمیوں کا گلا نہیں گھونٹا گیا مگر ان کا رخ منفی کی بجائے مثبت سمت میں موڑ دیا گیا۔

روحانی زندگی

عہد نبوی کے مدنی معاشرہ کے دنیاوی اور مادی پہلو کا ذکر تو ہم کر چکے ہیں، اب ہم اس دور کی روحانی زندگی کی طرف آتے ہیں۔ اسلام میں دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسلام میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں ہے کہ جو شخص روحانیت میں اعلی مقام حاصل کرنا چاہے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ دنیا اور اس کی لذات کو ترک کر دے۔ بعض صحابہ نے ارادہ کیا کہ وہ پوری پوری رات نماز پڑھیں گے، ہمیشہ روزہ رکھیں گے اور نکاح کو ترک کر دیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت ناراض ہوئے اور آپ نے فرمایا: ”کیا آپ لوگوں نے ایسی بات کہی ہے؟ اللہ کی قسم! میں اللہ سے آپ سے زیادہ ڈرتا ہوں اور اس معاملے میں زیادہ محتاط ہوں، مگر میں روزے بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ میں (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے منہ موڑا، وہ مجھ سے نہیں ہے۔“[58] اس طرح سے مسلم معاشرے میں ایسی روحانیت پیدا ہوئی جس میں مادیت اور روحانیت میں تضاد موجود نہیں تھا اور ایک شخص دنیاوی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی روحانیت کے اعلی مدارج طے کر سکتا تھا۔ اسلام میں کسی چلے، مراقبے اور ریاضت کا تصور پیش نہیں کیا گیا بلکہ روحانیت کی معراج نماز کو قرار دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی روزانہ کی روٹین کو نماز کے ذریعے منظم کیا۔ دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں مگر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تہجد کی نماز اضافی طور پر فرض تھی جبکہ عام مسلمانوں کے لیے یہ نفل تھی۔ بہت سے صحابہ بھی

اس نماز کو پڑھا کرتے تھے۔ ان کے دن کا آغاز ہی تہجد سے ہوا کرتا تھا۔ رات کو اٹھ کر اللہ تعالی سے دعا و مناجات کرنا، رونا، گڑگڑانا اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنا۔۔۔ یہ سب امور صحابہ کرام کی روحانی مشقیں تھیں۔ طلوع فجر کے وقت یہ لوگ مسجد میں آکر اجتماعی عبادت کرتے۔ بہت سے لوگ طلوع آفتاب تک ذکر اور دینی تعلیم میں مشغول رہتے اور اس کے بعد اشراق کے نوافل پڑھتے۔ اس کے بعد ظہر کی نماز تک اپنے دنیاوی کام کاج اور کاروبار کرتے۔ دوپہر میں ظہر کی نماز پڑھتے جس میں دنیاوی کاموں کے عین درمیان ایک بار پھر اللہ تعالی سے رابطہ ہوتا۔ اس کے بعد پھر کام کاج میں مشغول ہو جاتے یا آرام کرتے۔ سہ پہر کے وقت اپنے کاموں کو سمیٹ کر عصر کی نماز پڑھتے اور پھر مغرب اور عشا تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ اس کے بعد یہ لوگ رات کو جلد سو جایا کرتے تھے تاکہ تہجد کے وقت اٹھ سکیں۔

روحانی احساس کو اجاگر کرنے کے لیے طہارت اور پاکیزگی کو خاص اہمیت دی گئی۔ ہر نماز کے لیے وضو لازم قرار دیا گیا جس سے مسلمانوں میں تر و تازگی اور پاکیزگی کا احساس پیدا ہوتا۔ ازدواجی عمل کے بعد غسل کو فرض اور جمعہ کے دن سنت قرار دیا گیا تاکہ پاکیزگی کا یہ احساس برقرار رہے۔ پانی نہ ہونے یا اس کے استعمال کرنے میں کوئی مانع ہونے کی صورت میں تیمم کو لازم کیا گیا تاکہ پاکیزگی کا نفسیاتی احساس برقرار رہے۔

رمضان المبارک کو خاص طور پر روحانی ارتقا کا مہینہ قرار دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں عبادت اور خیرات کو بہت زیادہ کر دیتے تھے اور صحابہ کرام بھی اسی پر عمل کرتے تھے۔ دن میں روزہ رکھتے اور رات کا بڑا حصہ اللہ تعالی کی عبادت میں بسر کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس درجے کی نماز پڑھا کرتے تھے کہ آپ کے قدم مبارک سوج جاتے۔ ایک دن عرض کیا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا: ''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''[59]

صحابہ کرام کی یہ نماز محض ایک جسمانی عمل نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ یہ ایک لائیو ایکسرسائز تھی جس میں وہ یہ تصور کرتے کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کر رہے ہیں اور اللہ تعالی کے سامنے حاضر ہیں اور گویا اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہی تصور ہوتا کہ اللہ تعالی انہیں دیکھ رہا ہے۔[60] چونکہ ان کی زبان عربی تھی، اس لیے وہ نماز پڑھتے ہوئے پوری طرح واقف ہوا کرتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نماز میں اس درجے میں مگن ہو جاتے کہ انہیں گرد و پیش کی ہوش نہ رہتی۔ ایک صحابی کو تیر آکر لگا۔ اسے نکالنا ایک تکلیف دہ امر تھا۔ انہوں نے نماز شروع کر لی اور اس میں ایسے مگن ہوئے کہ ان کے ساتھیوں نے تیر نکال لیا اور انہیں تکلیف کا احساس نہ ہوا۔ عہد نبوی کی روحانی زندگی کو قرآن مجید میں اللہ تعالی نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ آپ لوگ اوقات کو صحیح شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اس نے آپ پر مہربانی فرمائی۔ اب جتنا قرآن آسانی سے آپ پڑھ سکتے ہوں، پڑھ لیا کریں۔ اسے معلوم ہے کہ آپ میں کچھ لوگ مریض ہوں گے، کچھ اللہ کے فضل (رزق) کی تلاش میں سفر کر رہے ہوں گے اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہے ہوں گے۔ پس جتنا قرآن بآسانی پڑھا جا سکے، پڑھ لیا کیجیے۔ نماز قائم رکھیے، زکوۃ دیجیے اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہیے۔ جو بھلائی آپ لوگ اپنے لیے آگے بھیجیں گے، اسے اللہ کے ہاں موجود پائیں گے کہ وہی (بھلائی) زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ اللہ سے مغفرت مانگتے رہیے، بے شک اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ (المزمل 73:20)

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ.

یہ وہ لوگ ہیں جو عرض کرتے ہیں: "ہمارے رب! یقیناً ہم ایمان لائے، آپ ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما دیجیے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لیجیے۔ یہی لوگ ثابت قدم، سچے، نرم دل، (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور سحر کے وقت مغفرت مانگنے والے ہیں۔" (آل عمران 3:17)

یہی وجہ تھی کہ عیسائیوں کے ایک جاسوس، جنہوں نے مسلمانوں کا مشاہدہ کیا تھا، انہوں نے ان کی کیفیت کو اس طرح بیان کیا کہ یہ لوگ دن میں مجاہد اور رات میں راہب ہوتے ہیں۔[61]

عہد نبوی کی تہذیبی تاریخ کا خلاصہ

عہد نبوی کی تہذیبی تاریخ کا خلاصہ ہم اس چارٹ میں بیان کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم دور جاہلیت کے عربوں کی تہذیب کا خلاصہ بھی بطور تقابل بیان کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے عہد نبوی کی کیا خصوصیات ہیں:

	دور جاہلیت	عہد نبوی
فن تحریر	فن تحریر موجود تھا مگر کم ہی چیزیں لکھی جاتی تھیں۔	قرآن مجید اور احادیث نبوی لکھی گئیں اور فن تحریر کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔
علم و دانش	علم و دانش کی جانب توجہ بہت کم تھی۔	علم و دانش کی جانب توجہ مبذول کروائی گئی اور لوگ علم سیکھنے لگے۔
تعلیم و تربیت	تعلیم و تربیت کا کوئی منظم نظام موجود نہ تھا۔	قرآنی مدارس کا نظام قائم ہوا۔

	دور جاہلیت	عہد نبوی
سیاسی نظام	متفرق قبائلی ریاستیں موجود تھیں۔	ان سب قبائلی ریاستوں کو داخلی خود مختاری کے ساتھ ایک بڑی فیڈریشن کا حصہ بنا دیا گیا۔
بین القبائل تعلقات	بہت سے قبائل ایک دوسرے کے دشمن تھے۔	اسلام کے رشتے نے ان قبائل کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا اور دور جاہلیت کی دشمنیاں ختم ہو گئیں۔
حکومتی شعبہ جات	حکومتی شعبہ جات موجود نہیں تھے۔	حکومتی شعبہ جات کے قیام کے عمل کا آغاز ہوا اور گڈ گورننس کے اصول مرتب کیے گئے۔
امن وامان	قبائلی دشمنی کی وجہ سے قتل وغارت کا بازار گرم تھا۔	قبائلی دشمنیوں کو ختم کر کے پورے عرب میں امن قائم کیا گیا۔
تجارت	معیشت کی حالت دگرگوں تھی کیونکہ سوائے قریش کے، دیگر قبائل کے قافلے محفوظ نہیں تھے۔	امن وامان کے سبب تجارت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔
زراعت	بہت سی زمینیں بے آباد تھیں۔	زمینوں کی آبادکاری کو بہت اہمیت دی گئی۔
معاشرتی اقدار	مہمان نوازی اور ایفائے عہد کو غیر معمولی حیثیت حاصل تھی۔	مساوات، اخوت، عدل، میرٹ کو بنیادی حیثیت دی گئی اور مہمان نوازی اور ایفائے عہد کی اقدار کی حیثیت برقرار رکھی گئی۔
خواتین کے حقوق	خواتین کو حقوق حاصل تھے مگر بعض معاملات میں ان کی حیثیت کمزور تھی۔	خواتین کو مکمل حقوق دیے گئے اور قانون سازی میں ان کا خاص خیال رکھا گیا۔
غلاموں کے حقوق	غلاموں کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔	غلاموں کی آزادی کی گارنٹی دی گئی۔ موجود غلاموں کے حقوق مقرر کیے گئے اور آئندہ غلام بنانے کے اکثر طریقوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ سابق غلاموں کا اسٹیٹس بلند کیا گیا۔
طبقاتی تقسیم	طبقاتی تقسیم بہت نمایاں تھی۔	طبقاتی تقسیم کو کم کیا گیا اور امیر وغریب کو محبت کی لڑی میں پرویا گیا۔
شہری امور (Civic Affairs)	شہری امور کے بارے میں بہت زیادہ آگاہی نہیں تھی۔	شہری امور سے متعلق آگاہی کی مہم چلائی گئی اور مدینہ کی بہترین ٹاؤن پلاننگ کی گئی۔

	دور جاہلیت	عہد نبوی
تفریح	تفریح کو بہت اہمیت دی گئی۔	تفریح کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا مگر اس کا رخ مثبت سرگرمیوں کی طرف موڑ دیا گیا۔
روحانی زندگی	سوائے چند حنفا کے، عرب بالعموم مادیت پرست تھے۔	نماز کی شکل میں روزانہ روحانی مشق کا اہتمام کیا گیا اور خالق سے لو لگانے کو بہت اہمیت دی گئی۔ رہبانیت کو ممنوع قرار دیا گیا۔

[1] محمد حمید اللہ۔ الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ۔62-59۔ بیروت: دار النفائس۔

[2] بخاری۔ کتاب المغازی۔ حدیث4086

[3] بخاری۔ کتاب الاجارہ۔ حدیث2165

[4] بخاری۔ کتاب الاحکام۔ حدیث6736

[5] بخاری۔ کتاب الہبہ۔ حدیث2457

[6] بخاری۔ کتاب المناقب۔ حدیث3571

[7] ایضا۔ حدیث3569

[8] مسلم، کتاب الفرائض، حدیث1619

[9] بخاری، کتاب المزارعۃ، حدیث2195

[10] بخاری۔ کتاب المزارعۃ۔ حدیث2210

[11] بخاری۔ کتاب المساقاۃ۔ حدیث2247

[12] بخاری۔ کتاب المزارعۃ۔ حدیث2216

[13] ابو یوسف۔ کتاب الخراج۔161

[14] بخاری۔ کتاب المغازی۔ حدیث3995

[15] بخاری، کتاب المزارعۃ، حدیث2202

[16] بخاری۔ کتاب المساقاۃ۔ حدیث2233

[17] بخاری۔ کتاب المساقاۃ۔ حدیث2230

[18] بخاری۔ کتاب المساقاۃ۔ حدیث2241

[19] بخاری۔ کتاب المساقاۃ۔ حدیث2244

[20] بخاری۔ کتاب البیوع، حدیث1966

[21] محمد عبد الحئ کتانی۔ التراتیب الاداریہ۔72-2/27

[22] بخاری۔ کتاب البیوع۔ حدیث1945

[23] بخاری۔ کتاب البیوع۔ حدیث1976

[24] بخاری۔ کتاب البیوع۔ حدیث2043

[25] بخاری۔ کتاب البیوع۔ حدیث2040-2036

[26] بخاری۔ کتاب الجنائز۔ حدیث1182

[27] بیہقی۔ مسند احمد۔ حدیث23489

[28] بخاری۔ کتاب المناقب۔ حدیث3524

[29] بخاری۔ کتاب الصلوۃ۔ حدیث661

[30] النسا12-4:11

[31] البقرۃ242-2:224

[32] النسا4:3

[33] النسا4:32

[34] دیکھیے بخاری و مسلم، کتاب العتق۔

[35] ان تمام اقدامات کی تفصیل اور حوالہ جات کے لیے دیکھیے: اسلام میں ذہنی اور جسمانی غلامی کے انسداد کی تاریخ۔ باب11-7

[36] Omer, Dr. Spahic. ***The Prophet Muhammad and Urbanization of Madinah***, P 113. www.islamicmediacity.com/.../IslamonlineMadinahUrbanization.doc (2 March 2013)

[37] بخاری۔ کتاب الاستئذان۔ حدیث5943

[38] بخاری۔ کتاب الاوقاف۔ حدیث2626

[39] مسلم۔ کتاب المساقاۃ۔ حدیث1613

[40] ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ حدیث2629

[41] مسلم۔ کتاب الایمان۔ حدیث58

[42] مسلم۔ کتاب الآداب۔ حدیث2156

[43] بخاری۔ کتاب الاستئذان۔ حدیث5938

[44] ابوداؤد۔ کتاب الطہارۃ۔ حدیث26

[45] بخاری۔ کتاب البیوع۔ حدیث1945

[46] بخاری۔ کتاب الاعتصام والسنۃ۔ حدیث6905

[47] بخاری۔ کتاب العیدین۔ حدیث907

[48] بخاری۔ کتاب الادب۔ حدیث5850, 5821, 5779, 5647

[49] بخاری۔ کتاب الزکوۃ۔ حدیث1392

[50] ابوداؤد۔ کتاب الجہاد۔ حدیث2578

[51] اسد الغابہ بحوالہ کتانی۔ 2/239

[52] بخاری۔ کتاب البیوع۔ حدیث2112

[53] بخاری۔ کتاب الاشربہ۔ حدیث5268

[54] ابن جریر طبری۔ تفسیر آیت24:33

[55] ترمذی۔ کتاب البیوع۔ حدیث1282

[56] بخاری۔ کتاب المغازی۔ حدیث3779

[57] بخاری۔ کتاب النکاح۔ حدیث4867

[58] بخاری۔ کتاب النکاح۔ حدیث4776

[59] بخاری۔ کتاب التفسیر۔ حدیث4556

[60] بخاری۔ کتاب الایمان۔ حدیث50

[61] طبری۔ تاریخ الامم والملوک۔ اردو ترجمہ: سید محمد ابراہیم ندوی۔ 2/197-2۔ کراچی: نفیس اکیڈمی۔